Creator - Talib Allahabadi.

Publisher - Raj Sahab Ram Dayal Aggrawal (Allahabad).

Date - 1946.

Pages - 156.

Subjects - Urdu Adab - Tanqeed.

MUKADAMA-I-ADAB-I-URDU

مقدمۂ ادب اردو

Recommended for Supplementary reading in Urdu for High Schools

BY

TALIB ALLAHABADI

ALLAHABAD

RAI SAHIB RAM DAYAL AGARWALA

Publisher

1946

Price Re. 1/

دیباچہ

یہ چند صفحات جو "مقدمہ ادب اردو" کے زیر عنوان حاضر ہیں۔ ان کے مقاصد حسب ذیل ہیں۔

(۱) ادب اردو کی حقیقت، اصناف اور اُن کے فروق کیا ہیں۔

(۲) ادب اردو سے بہ حیثیت ادب کے روشناس ہو جانا۔

(۳) مطالعہ کتب کے بعد، غور و فکر، تخیّل و تصور سے کام لے کر ہر بات کی تہ تک پہنچنا۔

(۴) ادب کے تمام اجزائے ترکیبی میں جو اصول و قوانین، آئین فطرت کے مطابق ہیں اُن کا دریافت کرنا۔

(۵) خیالات کے نظم و اظہار میں حکیمانہ اختصار و صداقت، فلسفیانہ دلائل و براہین اور منطقی انداز بیان کا خیال رکھنا۔

یہ چند صفحات میرے سات مہینوں کی لگاتار کوشش کا نتیجہ ہیں۔ زیادہ وقت، غور و فکر میں گذرتا تھا۔ ذیل میں ان تصانیف اور مضامین کی فہرست ہے جن سے مجھے اس تصنیف میں مدد ملی ہے اور جن کے مطالعہ سے ناظرین کو اس کتاب کے سمجھنے میں بہت مدد ملے گی لیکن یہ واضح رہے کہ میں نے نہ تو کسی جگہ ترجمہ کیا ہے نہ اقتباس و اخذ سے کام لیا

ہے۔ اِن میں سے ہر کتاب کا مطالعہ شروع سے اخیر تک ضرور کیا ہے۔ اور جو خیالات، جو مطالب، ذہن میں فطرتاً محفوظ رہ گئے ہیں، ان پر کئی کئی گھنٹے غور کرنے کے بعد کوشش کی ہے کہ اپنی زبان میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ ادا کر دوں۔

مجھے اقرار ہے کہ اس تصنیف کے بہت سے اجزا تشنہ ہیں جسکی وجہ صرف یہی ہے کہ "مقدمہ" کی حیثیت سے محض تعارف مد نظر ہوتا ہے اور اصولاً مبسوط و مطوّل اور جامع و مانع بحث کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جو عنوان تشنہ رہ گئے ہیں اُن میں سے ہر ایک پر مستقل اور علیحدہ تصنیف کی ضرورت ہے۔

شاید آپ کو تعجب ہو کہ اس تصنیف میں ابتدا سے انتہا تک شاذ و نادر حوالے دیے گئے ہیں اس کے وجوہ دو ہیں۔ ایک تو یہ کہ تخلیلی مضامین میں کثرت سے حوالے دینا آئین ادب کے خلاف ہے۔ اور دوسرے یہ کہ استقرائی شان جاتی رہتی ہے۔

اس تصنیف میں بہت سے خیالات میرے اپنے ہیں۔ اُن میں کس حد تک صداقت و لطافت یا کذب و کثافت ہے۔ اس کے فیصلہ کا مجھے کوئی حق نہیں۔ امید ہے کہ اہل نظر اور علم نواز حضرات اپنی تنقید و تقریظ سے مجھے مستفید ہونے کا شرف بخشیں گے۔ تاکہ آئندہ اشاعتوں میں جو خامیاں رہ گئی ہوں اُن کے دور کرنے کی فکر کی جائے۔

شکریہ

سب سے پہلے میں اُن تمام حضرات کا ممنون ہوں جنکی تصانیف یا مضامین سے مجھے غور و فکر اور خوشہ چینیوں میں مدد ملی ہے یا جنکی حوصلہ افزا تحریکات اور بیش بہا ہدایات کی رہبری کے بغیر یہ تصنیف آج جس صورت سے آپ کے سامنے ہے نہ ہوتی۔

فہرست تصانیف و مضامین

۱۔ انٹروڈکشن ٹو دی اسٹڈی آو انگلش لٹریچر۔
۲۔ سیسیم اینڈ لیلیز۔
۳۔ گلستان سعدی۔
۴۔ اپری ٹیشن۔
۵۔ مقدمہ شعر و شاعری۔
۶۔ مراۃ الشعر۔
۷۔ لکچرز بائی ایچ، ٹی، بوس۔
۸۔ لاک آن دی ہومیں انڈرسٹینڈنگ۔
۹۔ گلشن ہند۔
۱۰۔ آب حیات۔
۱۱۔ سیرۃ المصنفین
۱۲۔ دکن میں اُردو۔
۱۳۔ ناٹک ساگر۔
۱۴۔ دنیائے افسانہ۔
۱۵۔ روحِ تنقید۔

فہرست تصانیف و مضامین

۱۶۔ خمخانہ جاوید۔
۱۷۔ رسائل اردو سنہ ۱۹۲۷ء۔
۱۸۔ رسائل شمع سنہ ۱۹۲۵ء
۱۹۔ بکس اینڈ آینڈیلس۔
۲۰۔ لٹریچر اینڈ لینگویج۔
۲۱۔ پوئٹ اینڈ ہسٹری۔
۲۲۔ فلسفہ جذبات۔
۲۳۔ نیرنگ خیال۔
۲۴۔ حیات انیس۔
۲۵۔ ادب العرب۔
۲۶۔ رسائل سہیل سنہ ۱۹۲۶ء و سنہ ۱۹۲۷ء۔
۲۷۔ حیات دبیر۔
۲۸۔ اردو کی قومیت۔
۲۹۔ مجلات عثمانیہ۔ سنہ ۱۹۲۷ء۔
۳۰۔ مجلات نگار سنہ ۱۹۲۷ء
۳۱۔ اے ہسٹری آف اردو لٹریچر۔
۳۲۔ سائینس آف اسپیچ۔

فہرست تصانیف و مضامین

فہرست مطالب

ادب کا تعارف اور اُس کی خصوصیات

ادب اُردو کا موجودہ دور

ادب تین حرفوں کا ایک عام لفظ ہے جسے ہم لوگ اکثر سُنتے اور بلا تکلف تحریر اور تقریر میں استعمال کرتے ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ جہاں ہم نے کسی زبان کی ابجد پڑھی اپنے آپ کو ادب شناس جاننے لگے۔ جہاں دو چار ٹیڑھی سیدھی سطریں لکھنے لگے ادب نواز ہو جانے کا یقین ہو گیا۔ ایسے لوگ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں جو ادب کے صحیح مفہوم سے واقف ہوں۔ کچھ شک ہو تو دل پر ہاتھ رکھ کر پوچھ لیجئے۔ آج کل غریب اردو کی جان کشمکش میں پڑی ہوئی ہے۔ تحریر اور تقریر میں، مطابع اور مجالس میں، خطوط اور گفتگو میں، رسائل اور مباحث میں ہر جگہ اُس کی جان پر ستم توڑے جا رہے ہیں۔ ہر شخص اپنے آپ کو سارے جہان سے قابل سمجھتا ہے اور متمنی رہتا ہے کہ ساری دنیا یا کم سے کم سارا ہندوستان اُس کی ادب نوازی کا سکّہ ماننے لگے۔

زمانہ کا رنگ

اکثر احباب گٹھ بیٹھی اور تُک بندی کو شاعری سمجھتے ہیں، مبتذل خیالات اور بازاری فقرات کو ظرافت کی جان خیال کرتے ہیں۔ اپنی معلومات سے زیادہ لکھنے پر فخر کرتے ہیں۔ جس بحث کو اُٹھاتے ہیں آخر میں پہلے سے زیادہ اُلجھا کر دست بردار ہو جاتے ہیں۔ کسی کی کتاب پڑھ کر کچھ سمجھتے ہیں کچھ نہیں سمجھتے۔ کچھ غلط

سمجھاتے ہیں اور کچھ جان بوجھ کر غلط معانی لگا لیتے ہیں۔

مختلف جماعتیں

ہندوستان میں اس وقت مختلف جماعتیں پیدا ہوگئی ہیں۔ ایک جماعت ایسی ہے جو اُردو کو ہندوستان کی عام زبان بنانا چاہتی ہے۔ مگر شاید اس جماعت کے لوگ یہ نہیں جانتے کہ اُردو؛ وہ صحیح طور پر اُردو کہی جاسکتی ہے۔ آج سے نہیں جب سے پیدا ہوئی، بھارت کی سرزمین میں اکثر مقامات پر بولی جاتی ہے۔ یہ جماعت چاہتی ہے کہ اُردو زبان پھر اپنے اصلی مرکز پر لوٹ آئے۔ یعنی آج سے تین سو برس پہلے جس طور پر بولی جاتی تھی اُسی طرح اب بھی ہوجائے۔

ادبی نشو و نما بھی انسانی حیات سے دوش بدوش ہے

مجھے ہنسی بھی آتی ہے اور افسوس بھی ہوتا ہے، کیا وہ لوگ نہیں جانتے کہ زبان یا ادب کی حالت بالکل انسان کی طرح ہے، جس طرح بچہ بڑا ہوجاتا ہے اُسی طرح زبان اور ادب بھی زندہ ہستیوں کی طرح بڑھتے رہتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کسی جوان آدمی کو دوبارہ چھوٹا سا بچہ بنا سکیں۔

ادب پر خارجی اثرات

زبان اور ادب پر ضروریات زندگی اور ماحول ملکی اور مدنی حالات، سیاسی اور علمی تحریکات، حکمت (سائنس) و فلسفہ کی ایجادات، معاشرتی اور علمی انقلابات کا اثر برابر پڑتا رہتا ہے، اور بالکل اسی طرح جیسے ہماری آپ کی حیات پر ان

چیزوں کی تاثیر ہوتی رہتی ہے۔ آج جتنے الفاظ جتنے محاورات جتنے محاکات جتنی کتابیں، جتنی اصطلاحات، جتنے علوم و فنون، جتنے اشعار جتنے رسائل و صحائف اردو میں موجود ہیں۔ وہ ایک دن یا ایک برس یا ایک صدی میں جمع نہیں ہوئے بلکہ مختلف زمانوں میں بڑھتے بڑھتے آج اس درجہ تک پہنچے ہیں۔

طرز ادا کی سادگی مجھے اس بات سے بالکل اتفاق ہے کہ طرز ادا انتہا سادہ، بہت دلکش، اور عام فہم ہونا چاہیئے جہاں تک ممکن ہو متروکات، بعید المعنی، مغلق، ثقیل، گنجلک اور غیر مستعمل چیزوں سے بچنا چاہیئے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ بعض نکات کا خیال رکھنا چاہیئے۔

الفاظ کا تعین ۱۔ علوم و فنون کی تصنیف و تالیف میں مصطلحات اور الفاظ معین ہونے چاہئیں۔ اور ہر لفظ اپنے معنی اور مفہوم کے اعتبار سے نہایت وسیع اور موثر ہونا چاہیئے۔ ورنہ ایک ایک لفظ کے مفہوم ادا کرنے میں جملے کے جملے درکار ہوں گے، نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ تو تسلسل کلام باقی رہ جائے گا، نہ بلاغت پیدا ہوگی اور نہ معنی صاف ہوں گے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ فرمایئے۔ ہم کو یہ کُلیہ منطقی بیان کرنا ہے کہ استقرار میں جوہر کا ملحوظ رکھنا فرض ہے۔ نہ کہ ان کے اغراض و خصائص کا۔"

ورنہ بیکار کی طوالت ہوگی اگر آپ خواہ مخواہ الفاظ خط کشیدہ کا استعمال نہ کریں تو ہر لفظ کی تشریح کے لیئے کئی کئی جملے درکار ہوں گے۔ اسی ایک مختصر سے جملہ کو کم سے کم الفاظ میں یوں کہنا

پڑے گا۔ جب آپ بہت سی ایسی چیزوں سے جو الگ الگ ہوں کوئی اصولی نتیجہ نکالنا چاہیں تو ان کی ان باتوں کا ملحوظ رکھنا فرض ہے جو اُن کی طبیعت کا جزو ہیں۔ جن کے بغیر وہ چیزیں اپنے اصلی نام کی مستحق نہ رہ جائیں گی۔ نہ کہ ان صفات کا جو ان میں وقتی طور پر خارجی یا داخلی اسباب و علل سے پیدا ہو گئی ہیں یا ان کے لئے مخصوص ہیں" اب آپ خود ہی دونوں کا فرق دیکھ لیجئے۔

بقاء و انتقال الفاظ دونوں ضروری ہیں

۲۔ یہ ٹھیک ہے کہ جہاں کہیں ہم کو سادے لفظ یا محاورات ملتے ہوں ہم عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ کام میں نہ لائیں مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ جو الفاظ زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں یا عام طور پر بولے جاتے ہیں اُن کی جگہ خواہ مخواہ ہندی، ترکی، بھاشا، انگریزی سنسکرت یا کسی اور زبان کے لفظ لاکر، ناموزونیت اور غیر مانوسیت پیدا کریں۔ یہ باتیں صرف ہندی بھاشا پراکرت، پرتگالی۔ فارسی، عربی یا انگریزی پر موقوف نہیں۔ ہماری زبان میں جو الفاظ داخل ہو گئے ہیں ان کو باقی رکھنا چاہیے۔ اور دوسری زبانوں سے علوم و فنون، سیر و سیاحت، تدقیق و تحقیق سے مدد لے کر الفاظ و اصطلاحات وغیرہ حاصل کرنے چاہئیں۔

انتقال خیالات

۳۔ جہاں کہیں سے نئے خیالات اچھوتے مضامین مل سکیں ہم کو اپنی زبان میں لے لینا چاہیے۔ مگر ہمیشہ اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ جو بات بھی ہو صاف ہو،

ستھری ہو۔ رفتہ رفتہ خود اردو کے پاس اتنا کافی سرمایہ ہو جائے گا کہ وہ دوسری زبانوں کی کفیل و سرچشمہ ہو جائے گی۔

عربی اور فارسی الفاظ کی کثرت

۴۔ دوسری جماعت میں ایسے اہل قلم اور اہل زبان حضرات شامل ہیں جو اردو کو بالکل عربی و فارسی بنا دینا چاہتے ہیں۔ جس جگہ آسان و فصیح الفاظ سے کام چل سکتا ہے وہاں خواہ مخواہ کے لیے نہایت بڑے بڑے نامانوس الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ عبارت ایسی رنگین ہوتی ہے کہ اکثر اوقات مضامین بلند ہوتے ہوتے غائب ہو جاتے ہیں۔ معنی اُلجھ کر رہ جاتے ہیں اور بالکل غالبؔ کی وہ شاعری نگاہوں میں پھر جاتی ہے۔ جس میں اُردو کا صرف ایک لفظ؛ خالص فارسی ہو جانے سے باز رکھتا ہے۔ مثلاً

شب خیالِ ذوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا   تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

زبان و ادب کی ترقی میں رکاوٹ

تھا کو بُود سے بدل دیجیے اور پورا شعر ریختہ کے بجائے خالص فارسی کا ہو جاتا ہے۔ یا مثلاً نثر کا یہ جملہ ملاحظہ فرمائیے۔ "مجلاتِ دورِ حاضرہ ایرانیہ کا مطالعہ بالاستیعاب، درستگی ذوقِ سلیم اور نفاست مذاق کا پتہ دیتا ہے"

ایسے لوگ اردو کو ترقی کی شاہراہ سے بہت دور کیے دیتے ہیں۔ اُن کی اردو کو سمجھنے والے ہندوستان میں بہت کم ہیں صرف وہی لوگ اس اردو کا لُطف اُٹھا سکتے ہیں جن کی عربی و فارسی کافی طور پر نکل چکی ہے۔ پھر ایسے لوگ کتنے ہیں؟ نتیجہ یہ ہے کہ زبان روز بروز محدود ہوتی جاتی ہے۔

اُردو خالص سنسکرت یا بھاشا کا بوجھ نہیں سنبھال سکتی

اُردو دانوں کی تیسری جماعت وہ ہے جو اس کو خالص سنسکرت یا خالص بھاشا بنا دینا چاہتی ہے۔ اُن کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اُن کی تمام کوششیں بیکار رہیں گی۔ وہ لوگ گھر میں، بازار میں، خطوں میں، سنسکرت پالی، اور پراکرت کے جسقدر الفاظ عام طور پر استعمال کرتے رہتے ہیں۔ اُردو اتنا ہی بوجھ سنبھال سکتی ہے۔ الفاظ اس سے زیادہ ہوئے بناوٹ اور بے لطفی پیدا ہوگی۔

انگریزی اصول و طرز کا خاکہ

جو انگریزی اصول و طرز کا خاکہ نہایت آزادی سے اپنی زبان میں کھینچ رہی ہے۔ اس جماعت میں ایسے لوگ زیادہ ہیں جو اُردو بھی بہت کم جانتے ہیں اور انگریزی بھی کم سمجھتے ہیں، چاہتے ہیں کہ ادائے مطالب، حُسن بندش اور نازک خیالی میں اُردو کی نظم و نثر بالکل انگریزی سے دوش بدوش ہو جائے۔ اپنے خیال کے مطابق اس کو ادب لطیف یعنی Light Literature کہتے ہیں۔ ان کو بھی چند امور پیش نگاہ رکھنے چاہئیں۔

انتقال خیالات

۱۔ ہر نیا خیال اور ہر جدید بات اُردو میں اس طرح منتقل ہونی چاہیئے کہ ان لوگوں کا دماغ بھی جو صرف اُردو داں ہیں اُس خیال یا بات کو آسانی سے محسوس کر لے۔ جو محض اُسی وقت ممکن ہے جب ایک زبان کے خیالات دوسری زبان میں منتقل کرنے والا شخص دونوں زبانوں پر پورا پورا قابو رکھتا ہو۔

خاصہ

۲۔ ہر زبان کا ایک خاصہ genius ہوتا ہے۔ اس لئے کسی زبان کو دوسری زبان کا ہم پلہ بنا دینا ایک دن کا کام نہیں۔ مدتیں درکار ہوتی ہیں۔

اختلاف معاشرت وغیرہ

۳۔ مختلف ممالک کا طرز معاشرت، فلسفۂ حیات معیار زندگی، اسلوب تمدن، حسن عقائد، مرتبہ سیاست جوش ملت، جذبہ قومی، درجۂ علمی غرض تمام چیزیں دوسرے ملکوں سے مختلف و ممتاز ہوتی ہیں۔ لہٰذا انتقال خیالات کے وقت ان تمام باتوں کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔ ورنہ نئے خیالات بالکل اجنبی اور بار خاطر محسوس ہوں گے۔

میں ان چاروں جماعتوں کی خصوصیات ثابت کرنے کے لئے معتدبہ مثالیں اور کثیر حوالے انھیں کی زبان اور قلم سے دے سکتا تھا مگر خیال ہوا کہ آبگینوں کو ٹھیس نہ لگ جائے۔ جو لوگ دور حاضرہ کی دنیائے صحافت اور عالم مطبوعات کی سیر کرتے رہتے ہیں اُن کے لئے صرف اشارات کافی ہیں علاوہ بریں اس جگہ مجھے اُن جماعتوں کی تنقید منظور نہیں جن کے لئے ایک علٰحدہ اور مبسوط رسالہ بجائے خود درکار ہوگا۔

کانفرنس کی ضرورت

کیا اچھا ہوتا اگر اُردو کے سچے دیوانوں کی فریاد میں اثر پیدا ہو جاتا۔ اگر یہ چاروں جماعتیں ایک ہو کر مل جل کر کام کریں اُس وقت تمام چیزوں کا معیار قائم ہو جاتا۔ اصول بن جاتے اور کشمکش کی جگہ متحدہ کوشش کی وجہ سے

سکون و ارتقا پیدا ہوجاتا۔ ملک و زبان کے بعض دور اندیش اور وسیع النظر حضرات نے اس امر کی تجویز کی ہے کہ اُردو کی ایک باضابطہ " آل انڈیا کانفرنس" قائم کی جائے۔ کاش نقار خانۂ ادب میں طوطی کی صدا سن لی جائے اور غریب اُردو آئے دن کی کشاکش سے چھوٹ جائے۔ اس طرح کی کانفرنس کامیاب ہوگی یا ناکام رہے گی اس کا اندازہ اور فیصلہ ابھی سے قبل از وقت ہے۔ مگر اس طرح کی کانفرنس کے فوائد ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ جب ہزاروں دل ایک ہوجائیں گے تو کیسا ہی مشکل طلسم کیوں نہ ہو فتح ہوجائے گا۔

ادب کے مختلف معنی

لیجئے۔ میں ادب کا تعارف کراتے کراتے کہاں کا کہاں پہنچ گیا۔ خیر۔ پھر اسی نقطہ پر آتا ہوں۔ یہاں جس 'ادب' کا ذکر ہے اس سے تعظیم' یا تہذیب' یا تمیز' یا شعور مراد نہیں ہے۔ جیسا عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں۔ با ادب بانصیب یا بے ادب بے نصیب' یا بزرگوں کا ادب کرنا چاہئے۔ یا ادب سے گفتگو کرو۔ بلکہ وہ ادب مراد ہے جس کو انگریزی میں Literature کہتے ہیں۔ جو بجائے خود ایک مکمل فن ہے جس کی وسعت بحر ذخار سے کم نہیں جس کا مکمل مفہوم کسی ایک ہم معنی۔ قریب المعنے۔ یا مترادف لفظ میں ادا نہیں ہوسکتا۔ لہذا اس کی چند اہم ترین خصوصیات کا ذکر جُدا جُدا کیا جاتا ہے۔ اور سب کی مثالیں دی جاتی ہیں تاکہ پڑھنے والوں کے دماغ پر " ادب" کا ایک ہلکا سا نقشہ اُتر آئے۔

بقا — ادب ایک سدا بہار چمن ہے۔

ادب کی بقا — ادب کی بقا کے متعلق کچھ کہنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔ یہ سچ ہے کہ بعض زبانیں پیدا ہوئیں۔ ترقی کرتی گئیں۔ اور قوم کے تنزل کے ساتھ ساتھ صفحۂ دنیا سے مٹ گئیں۔ کتابیں چمن ادب کے بیل بوٹے ہیں۔ جب تصانیف ضائع ہوگئیں تو بظاہر ادب بھی ضائع ہوگیا۔ مگر حقیقتاً ادب کبھی ضائع نہیں ہوتا۔ اگر ایک زبان یا کئی زبانیں مٹ جائیں تو اُن کے اثرات دوسری زبانوں میں منتقل ہوکر باقی رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ نئی زبانیں ہمیشہ پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ اس طور پہ کوئی کیاری سنسان ہونے نہیں پاتی۔ طرح طرح کے پھول پودے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ اور اسی لئے خزاں کا کوئی جھونکا اب تک تاریخی نقطۂ نگاہ سے ایسا نہیں آیا جو چمنستان ادب کو یک لخت تاراج کرکے بنجر بنادیتا۔

سلسلہ — یہ ایک دریا ہے جس کی موجیں بڑھتی ہی جاتی ہیں۔ کیا آپ نے کبھی کسی پہاڑ سے دریا کو نکلتے ہوئے دیکھا ہے۔ ہر دریا اپنے منبع کے پاس بہت کم چوڑا مگر نہایت تیز ہوتا ہے۔ جیسے جیسے چٹانوں سے ٹکراتا ہوا، پہاڑ کی طرف ہاتھ پھیلاتا ہوا، موتیوں کی چادریں بچھاتا ہوا، آبشاروں کو دُلہن بناتا ہوا، میدانوں سے پھرتا پھراتا ہوا بڑھتا جاتا ہے۔ اُس کی موجیں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ ایک موج میں ہزاروں بل اور ہر بل میں ہزاروں موجیں

پیدا ہوجاتی ہیں۔ اگر آپ کو ایسے نظر نواز مناظر کی سیر کا اتفاق نہ ہوا ہو تو یاد کیجیے۔ بچپنے میں آپ نے کسی دریا یا کسی تالاب یا کسی ظرف پُر آب میں کوئی کنکری پھینکی ہے۔ کنکری کے گرتے ہی ایک حلقہ سا پیدا ہوجاتا ہے جو رفتہ رفتہ بڑھتا اور ہزاروں لہریں پیدا کرتا ہوا اپنے ساحلوں سے ٹکراتا ہے۔ اس ٹکرانے کے ساتھ ہی بے شمار لہریں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اور یہی سلسلہ بہت دیر تک جاری رہتا ہے۔ بعینہٖ یہی حال ادب کا ہے۔ اُردو ہی کو لے لیجیے۔ آج سے صرف چالیس برس پہلے اس دریا میں جتنی موجیں تھیں۔ اگر بہت زیادہ نہیں تو اس سے چالیس گُنا لہریں اب ہیں۔ یہی حال اُس وقت سے جب حضرت آزاد کے بقول اُردوئے شاہ جہانی میں یہ یتیم بچہ، بھولا بھالا معصوم پھرتا پھراتا نظر آتا تھا۔ لہٰذا ارتقاء ادب کا ایک سرسری مطالعہ بھی اس امر کے لیے کافی دلیل ہے کہ دریائے ادب کی موجیں کبھی کم نہ ہوں گی۔

قدر و قیمت یہ ایک جواہر خانہ ہے جس کی سیر روح کی راحت ہے۔ ایسی گراں قدر اور انمول دولت ہے جس کی قیمت کا اندازہ کسی طور پر ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر انسان کے پاس تمام دنیا کی دولت موجود ہو اور کسی وجہ سے سہی، روح کی راحت میسر نہ ہو تو سب بیکار ہے۔ اور اگر روح کی راحت میسر ہو جائے تو ساری دنیا ہیچ ہے۔ اب رہا یہ امر کہ ادب روح کی راحت کا سبب ہے یا نہیں؟ دنیا کے زبردست فلسفیوں کو لے لیجیے۔ (سقراط، ارسطو، افلاطون) زبردست حکیموں کو لے لیجیے، خود

اُردو کے مُحسنین پر غور کر لیجئے۔ آپ کو بلا مبالغہ ہر عالم کی تصانیف میں اس امر کا سُراغ لگ جائے گا کہ مشکل ترین اوقات میں اور صبر آزما حادثات میں ادب اور صرف ادب اُن کی روح کی راحت کا سبب رہا ہے۔ یہ بحث اس قدر لطیف ہے کہ نفسِ مفہوم پر جامۂ الفاظ اور لباسِ بیان بھی بار ہوتا ہے۔ سُننے اور سمجھنے کی بات نہیں۔ محسوس کرنے اور لطف اندوز ہونے کی بات ہے۔

تعلق حیاتِ انسانی اور ادب ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔
قبل اس کے کہ اس دعوے کی دلیل میں کچھ عرض کروں یہ التماس کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہماری زندگی کے مختلف پہلو، مدارج اور مختلف نظریے ہیں۔ سانس لیتے رہنا حیاتِ انسانی نہیں ہے صرف کھانا پینا اور مرے کرنا بھی حیاتِ انسانی نہیں۔ آدمی ہونا اور چیز ہے، انسان ہونا اور چیز ہے۔ غالب ایسا فلسفی کہتا ہے: کہ آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا، واقعی بات یہ ہے کہ آدمی تو سبھی ہیں مگر انسان کہے جانے کے مستحق بہت کم ہیں۔ حیات کی نعمت صرف ہمیں کو میسّر نہیں۔ دنیا کی بے شمار مخلوق ذی حیات ہے، عالمِ حیوانات کی اَن گِنت ہستیاں جان رکھتی ہیں، پانی کے ایک ایک قطرے میں کروڑہا ذی حیات کیڑے ہوتے ہیں۔ ہماری ہر سانس کے ساتھ ہوا کے بے شمار ذی حیات جراثیم آتے جاتے رہتے ہیں۔ ماہرین علم الاشجار کے تازہ ترین انکشافات سے ہویدا ہے کہ تمام درخت، پتّے، پھل پھول، بیج، لتریں، بیلیں، جھاڑیاں، ٹہنیاں، جڑیں سب جاندار ہیں اور ہماری طرح

ہنستے ہیں، روتے ہیں، ترقی و تنزل کی منزلیں طے کرتے ہیں۔ اور بہت سے اثرات سے ہماری ہی طرح متاثر ہوتے ہیں۔ آدمی کو ان تمام ذی حیات اشیاء سے جو خوبیاں ممتاز کرتی ہیں وہ نطق کی نعمت، قوت کی فراوانی، جذبات اور حیات مخصوصہ ہیں۔ ان تمام چیزوں کا صحیح مصرف جو حسب منشائے فطرت ہو آدمی کو انسان بناتا ہے۔ اب آپ ہی آسانی سے حیات انسانی کا موازنہ ادب کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ یہ دونوں ایک ہی چہرہ کی دو آنکھیں ہیں۔ ناممکن ہے کہ ایک کو صدمہ پہنچے اور دوسری متاثر نہ ہو۔ دونوں کی حسیات مشترک ہیں۔ مسرت و الم کی تاثیر دونوں پر یکساں طور سے ہوتی ہے۔ ایک کے بغیر دوسری نامکمل ہے۔ دونوں مل کر آدمی کو انسان بناتی ہیں۔ کچھ شک ہو تو اقوام عالم بلکہ بنی نوع آدم کے افکار کی مکمل تاریخ کا مطالعہ کر لیجئے۔ دونوں نے ساتھ ساتھ ترقی کیا ہے اور ہر زمانے میں اپنا اپنا جوہر دکھایا ہے۔

تکمیل

اسی سلسلہ میں یہ بھی گوش گزار کر دینا چاہتا ہوں کہ تکمیل انسانیت کے لئے تکمیل ادب ضروری ہے۔ ہمارے لئے یا کسی کے لئے۔ صرف یہ کافی نہیں کہ اردو، ہندی، انگریزی یا سنسکرت، پالی، جرمن، فرانسیسی یا کوئی اور زبان اس کی مادری زبان ہے، جب تک ہم کو اپنی مادری زبان پر پورا قابو حاصل نہ ہوگا ہماری ہستی مکمل نہیں ہو سکتی۔

عمومیت

کسی ملک یا قوم کا ادب کسی مقام یا گروہ تک محدود نہیں نہ کسی قبیلہ یا جماعت کی ملکیت ہے۔ کیا آپ کبھی بھول کر بھی کہہ سکتے ہیں کہ فلاں لفظ یا حرف یا آواز ہماری ملکیت ہے؟ اس میں

ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ "ادب" کوئی "ادیب" ہو، ہمارا ہی مخلوق ہے۔ ہمیں سے ہے اور ہمارے ہی لیے۔ اس کے علاوہ اکتسابی ہے۔ خلقی یا فطری نہیں ہم ماں کے پیٹ سے کوئی ادب یا کوئی زبان سیکھ کر پیدا نہیں ہوتے۔ جس ماحول میں بڑے ہوتے ہیں اُسی کا اثر لیتے رہتے ہیں۔ اُردو ہی کو لے لیجئے اگر مسلمان یہ دعویٰ کریں کہ اُردو ہمیشہ مسلمان بادشاہوں کے محلوں میں پلی مخدرات کی گودوں میں پروان چڑھی۔ لہٰذا کوئی غیر قوم اس کو ہماری طرح نہیں جان سکتی تو بالکل بے بنیاد ہوگا۔ اس لئے اکثر ہندو، ادیب پنجابی، فارسی نژاد انگریز اور جاپانی ایسے گذرے ہیں جو مسلمانوں اور ہندوستانیوں سے کہیں زیادہ اُردو جانتے تھے۔ اس مطلب کی توضیح محض اس نظر سے کی گئی ہے کہ لکھنؤ اور دہلی والوں کا یہ دعویٰ کہ جو اُن کے شہر سے باہر ہو وہ صحیح معنوں میں ادیب یا زبان داں نہیں ہے اس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا کہ ان شہروں کی ہوا، فضا اور موسم کے اثرات صرف انہیں کے لئے مخصوص ہیں۔ ہر ہندوستانی کیا معنی، دُنیا کا ہر فرد "اُردو" ہی نہیں دنیا کی کسی زبان کا بشرط مطالعہ و موقعہ پورا ماہر ہو سکتا ہے۔

مرتبہ | ادب ملک تخیل کا سلطان ہے۔ اسی نظریہ سے ادب کی ضرورت وسعت کا اندازہ بھی صحیح طور پہ ہو جاتا ہے۔ قلم اس سلطنت کا وزیر اعظم ہے۔ صفحات کاغذ شاہی فرامین کی حیثیت رکھتے ہیں جو اس خمسہ اور ذہن کے متعلقہ و مخصوص سفیر و ایلچی ہیں۔ مشاہدہ، مطالعہ، متخیلہ، متصورہ، مدرکہ، حاسہ، متفکرہ، منفعلہ، فاعلہ، نباتی ادارۂ وزارت ہیں۔ قلم تحریر

تحقیق، تنقید، تحلیل، تجزیہ، تبصرہ، کابینۂ عظمےٰ کے اراکین ہیں۔ کلام بیان، قواعد زبان، مصطلحات، محاورات، محاکات، روزمرہ، استعارہ، ایجاد، تشبیہہ، تمثیل لسان، لغات، تراکیب، صنائع، بدائع فوجی افسر ہیں۔ حکمیات، نفسیات، حیوانات، نباتات، جمادات، معدنیات، کوک، اندرجال، سرود، شعر، موسیقی، اقتصادیات، معاشیات، الٰہیات، فلسفہ، فلسفۂ قدیم و جدید، ما قبل و ما بعد الطبیعات، منطق، اقلیدس، جغرافیہ، ریاضیات، اعداد، نجوم، تاریخ، سیر، رمل، جفر، فقہ، حدیث، جر ثقیل، مناظرہ و مرایا، معقولات، منقولات، فنون لطیفہ، مختصر یہ کہ جملہ علوم و فنون مجلس عامہ کے اراکین و سلاطین ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ایسی شخصی سلطنت میں تمام نظام دولت کا تناسب و توازن حکمران کی قابلیت و صلاحیت مذاق کی مناسبت سے ہوگا۔ ادب ملک تخیل کا حقیقی سلطان ہے۔ اس کا پورا اندازہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب آپ خود مطالعۂ باطن اور دقت نظر سے کام لے کر تمام علوم و فنون کی پیدائش۔ ارتقاء، انتشار اور بقا کے ہر پہلو کو غور سے دیکھیں۔ ادب نہ ہوتا تو کچھ نہ ہوتا۔ ادب نہ ہو تو کچھ نہ ہو۔

ادب کی وسعت

شاید اتنی تشریح کے بعد بھی بعض طبیعتوں سے رفع شک نہ ہوا ہو۔ میں اُن سے صرف یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ادب کا ایک جزو "نطق انسانی" یا طرز تکلم ہے اور صرف یہی نہیں اس لفظ میں اس قدر وسعت موجود ہے کہ آپ اُن تمام برقی اشارات و اثرات یا اعضاء کی حرکات و سکنات کو بھی ادب کے دائرہ میں پائیں گے

جو معنی خیز ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس کے بھروسہ پر ہیں نے اتنا بڑا دعویٰ کردیا ہے کہ ادب ہی سے جملہ علوم و فنون کا آغاز، نشو ارتقا اور بقا ہوتی ہے۔

احاطہ خصوصیات ناممکن ہے

اِن چند مہتم بالشان خصوصیات سے ادب کے بعض پہلو یقیناً روشن ہوجاتے ہیں۔ مگر تمام خوبیوں کی مکمل فہرست یا جامع تشریح انسانی طاقت سے باہر ہے۔ اس لئے کہ تمام علوم قدیمہ و متداولہ اور فنونِ گذشتہ و مروجہ کی معلومات تامہ ایک زندگی یا ایک آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔

ادب اُردو کا سرمایہ

ادب اُردو کا جواہر خانہ اس وقت دنیا کی بہت سی زبانوں کے مقابلہ میں نہ تو کم ہے نہ کم قدر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ابھی اس خزانہ میں بعض ایسے جواہر موجود نہیں جو ہونے چاہئیں تھے۔ مگر یہ کمی حوصلہ شکن نہیں ہمت افزا ہے، مایوس کن نہیں، جوش انگیز ہے۔ آج بھی اس میں ایسے انمول لعل و گوہر، زمرد، زبرجد، فیروزہ، یاقوت، یمنی و شجری موجود ہیں جو دنیا کے کسی اور خزانہ میں چراغ لے کر ڈھونڈ ھیے تو بھی نہ پایئے گا۔

تکمیل کے لئے ایک زمانہ چاہیئے

تکمیل خزانہ یا تکمیل ادب ایک دن کا کام نہیں۔ اُردو کو عالم وجود میں آئے ہوئے ابھی چار صدیوں سے زیادہ نہیں گذرا، پھر بھی اس قلیل مدت میں، اور صبر آزما حادثات و واقعات کے زیر اثر رہ کر اس نے جو کچھ جمع کرلیا ہے وہ قابل قدر

اور لائق رشک ہے۔

ادب کا موازنہ دوسری ادبیات سے

افسوس ہے کہ بعض پڑھے لکھے دوست اُردو کا موازنہ دوسری زبانوں کے ساتھ نہایت بے دردی سے کرتے ہیں۔ میں ایسے لوگوں سے با ادب عرض کروں گا کہ مقابلہ کرتے وقت چند امور مدِ نظر اور ملحوظِ خاطر رہیں۔

فرض کیجئے کہ آپ اردو کا مقابلہ انگریزی ادب سے کیجئے تو آپ کو

دونوں زبانوں پر عبور ہونا چاہیے

اردو اور انگریزی دونوں پر کافی عبور ہونا چاہیے۔ ورنہ لاعلمی، جہل، غلط فہمی، اغلاط اور اسقام کی وجہ سے سارا تختہ تباہ ہو جائے گا۔ اچھے کی جگہ برا اور برے کی جگہ اچھا نظر آئے گا۔ ادب کی معلومات سے صرف یہی مقصد نہیں کہ آپ لفظوں کو پڑھ کر معانی سمجھ لیں، لسان، قواعد، نحو، صرف، تقطیع، عروض، صنائع، بدائع، محاکات، محاورات، روزمرہ، اور کلام و اشعار کا تھوڑا بہت لطف اٹھا سکتے ہوں بلکہ آپ کو ادب کے تمام اجزا و اصناف پر قابو ہونا چاہیے۔ دونوں کی تاریخ ارتقا اور تبدیلیوں کے ہر ایک دور کی پوری پوری حقیقت معلوم ہونی چاہیے۔ دونوں کے تمام مستند ادیب، شعرا، نثار، ناقدین، عالمین، متکلمین، متخیلین، فلاسفہ وغیرہ سے واقف ہونا چاہیے ورنہ موازنہ ٹھیک نہ اترے گا۔

تقابل کے اصول و قوانین

۲۔ تقابل کے اصول و قوانین پر عمل کرنا چاہیے۔ تقابل بنفسہٖ نہایت دقیق اور مشکل امر ہے۔ ہر زبان میں اس علم کے متعلق بہت سی تصانیف نفسِ علم پر موجود ہیں

عام طور پر زبردست فلاسفر اور ادبا کے کارنامے موجود ہیں جو مشعلِ ہدایت اور خضرِ راہ بن سکتے ہیں۔ لیکن جذبۂ نور اور اخذِ حسن کی صلاحیت خود آپ میں ہونی چاہئے۔ ادبِ اردو میں افسوس ہے کہ فنِ تقابل پر میری نگاہ سے کوئی کتاب نہیں گذری۔ ہاں موازنۂ انیس و دبیر کی طرح اور بہت سے موازنے ضرور موجود ہیں۔ تقابل کا جزو اغلب تنقید ہے جو بجائے خود ایک مبسوط و مکمل فن ہے۔ تقابل کے اور قوانین یا اصول کی تشریح میرے نفسِ بحث سے غیر متعلق ہے۔ لہٰذا صرف اسی پر اکتفا کرتا ہوں کہ ان قوانین یا اصول کی معرفت کے لئے انسان کو تنقید، موازنہ اور مقابلہ کی مستند کتابیں غور سے مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ جن کے بغیر موازنہ کی شان ویسی ہو جائے گی جیسے کوئی اناڑی مالی، چنبیلی، جوہی، موتیا، ہارسنگھار، ببول کے کانٹے، کنول، سورج مکھی، خس و خاشاک، آمربوریا، اناناس، املی وغیرہ سب ایک ساتھ جمع کر دے اور اس طوفانِ بے تمیزی میں نہ رنگ کا پتہ چلے نہ خوشبو یا بدبو کا امتیاز باقی رہ جائے۔

احتیاطیں

موازنہ کے وقت خوش اعتقادی، تعصب، ہٹ دھرمی، جعلسازی، خوف، اضطرار، جلد بازی، نفرت، تنگ فراخی، یا کسی اپنے جذبے سے متاثر نہ ہونا چاہئے جو صحیح رائے قائم کرنے یا آزاد فیصلے پر پہنچنے میں مخل ہو سکے۔

قوانین کا عمل بہت مشکل ہے

لفظوں میں اصول مقرر کر دینا، آئین بنا دینا بہت آسان ہے۔ مگر عمل کے وقت بہت سی دقتوں کا سامنا ہوتا ہے۔ جذبات مذکورۃ الصدر صحتِ رائے کے لئے بہت

خطرناک ہیں۔ مگر انسان کے لیے ان سے پرہیز کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، روزمرہ کے تجربات شاہد ہیں کہ ہماری رائے یا فیصلہ میں ان جذبات کا عنصر اکثر غالب رہتا ہے۔ ایک معمولی سی مثال ملاحظہ فرمایئے۔

"دس ہم جماعت طلباء اپنی اپنی سائیکلوں پر سوار شام کی سیر سے سیر ہو کر دارالاقامہ کی طرف جا رہے تھے۔ یکایک آخری موڑ پر پہنچ کر ایک تانگہ داہنی جانب سے دکھائی دیا اور زید جو سب سے آگے تھا گھوڑے سے ٹکرا کر زمین پر گر گیا، اوپر سے کوئی چوٹ نہیں آئی۔ دماغ کی کچھ باریک شرائیں جو کنپٹی کے پاس تھیں پھٹ گئیں اور خون جاری ہو گیا۔ قریب کے ڈاکٹر کے پاس اس کو لائے مگر مایوس ہو کر سرکاری ہسپتال میں لے جہاں رات کے گیارہ بجے اس کا انتقال ہو گیا۔"

اب ملاحظہ فرمایئے۔ واقعہ صرف اتنا ہے مگر بیانات اور جرح وقدح کے دوران میں نفس حادثہ تو وہی بتایا جائے گا۔ لیکن مختلف پہلوؤں سے اس لئے کہ تانگہ والے پر اس حادثہ کا اثر اس اثر سے بالکل مختلف ہو گا۔ جو ہم جماعت لڑکوں پر ہوا تھا۔ اسی طرح تانگے پر جو لوگ سوار تھے ان کے اثرات تانگے والے اور طلباء دونوں سے مختلف ہوں گے۔ اور ظاہر ہے کہ تجربہ و تجزیہ میں اثرات کا رنگ ہمیشہ غالب رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ان جذبات میں سے کسی یا کئی کے زیر اثر تحقیق و تجزیہ سے کام لے تو اکثر ناکامیاب اور بعض اوقات غیر مکمل طور پر کامیاب ہوتا ہے۔ ان سے بچنے کی صورت صرف یہی ہے کہ مشق اور معلومات کی درستی طبیعت میں آزادی و

غیر جانب داری کے جوہر پیدا کیے جائیں۔ آپ نے خود دیکھا ہوگا کہ بڑے فلسفی، شاعر یا ادیب کی تصانیف پر مختلف نقاط نظر سے تنقیدیں کی جاتی ہیں اور ناقدین میں مختلف جماعتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جس کے اصلی علل کا سراغ لگانا ہو تو غور سے تحقیق کیجیے۔ متذکرہ بالا جذبات کی چھاؤں ہر جماعت میں ملے گی۔

۴۔ دونوں زبانوں کی مکمل تاریخ، ارتقا، تنزل، مدارج اور ان کے متعلق متفرق حالات سے واقفیت ہونی چاہیے۔

وقوف دنیا کی کوئی ایسی زبان نہیں جس کی تاریخ نہ ہو، میرا مطلب اُن زبانوں سے ہے جن میں ادب کی شان پیدا ہو چکی ہے۔ انگریزی ادب و زبان کی مبسوط تاریخیں سیکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ اردو زبان کی تاریخ مکمل حیثیت سے اس وقت نہیں لکھی گئی۔ ہاں محض تذکرے موجود ہیں۔ مثلاً سخن شعرا، آبِ حیات، سیر المصنفین، شعر الہند، خمخانۂ جاوید وغیرہ۔ لیکن تنقیدی نقطۂ نگاہ سے سب غیر مکمل ہیں۔ خدا بھلا کرے بابو رام سکسینہ کا جنھوں نے انگریزی میں A History of Urdu Literature لکھ کر محنت کے دھنی اور ہمت والے اہل قلم حضرات کے لیے ایک راستہ کھول دیا ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی ہو رہا ہے۔ اور مصنف صاحب اوراق پریشان کے نام سے شعرا و ادبا زمانۂ حاضرہ کے متعلق بھی کچھ لکھ رہے ہیں۔ یہ تاریخ اگرچہ بہ حیثیت مجموعی نہایت تشنہ ہے مگر نقش اول ہونے کے لحاظ سے قابلِ قدر، لائقِ تقلید اور مستحقِ ستائش ہے۔

زمانہ کے رنگ اور رویہ سے اُمید ہے کہ وہ دن دور نہیں جب ادب اور زبان اُردو کی مکمل تاریخیں لکھ دی جائیں گی۔ سُنا ہے کہ لاہور میں کسی صاحب نے اُردو کی انسائیکلوپیڈیا ۱۸ سال کی لگاتار محنت کے بعد تیار کی ہے۔ کاش صاحبِ مقدرت اور دل چلے حضرات کی مدد سے ہماری آنکھیں اس بیش بہا مسودہ کو کتابی صورت میں دیکھ سکیں۔ لائق مصنف کی عرق ریزی، خلوص، محبت اور مشقت تعریف سے مستغنی ہے۔ بہرطور ہر زبان اور ہر ادب کی تاریخ ہر دور میں تیار ہوتی جاتی ہے اور اسی سے ارتقاء و تنزل، مدارج و منازل کے تفصیلی حالات معلوم ہوتے جاتے ہیں۔ جب تک ناقد کو انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں کی ادب و زبان کی مکمل تاریخ کا علم نہ ہوگا۔ ادب کا موازنہ یقیناً غیر مکمل یا غلط ہو کر رہ جائے گا۔

خاصّہ ۵۔ یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ہر زبان اور ادب کی ایک مخصوص خوبی (genius) ہوتی ہے۔ اور ہر زبان یا ادب میں کسی نہ کسی حیثیت سے بعض کمزوریاں بھی ہوتی ہیں۔ اگر آپ انگریزی کی مخصوص خوبیاں اُردو میں ڈھونڈیں گے تو بالکل وہی نقشہ ہوگا جیسے آپ کسی مصوّر کے اوراق میں روح یا حیات کی تلاش کریں۔ بعینہٖ یہی حالت اس وقت ہوگی جب اُردو کی مخصوص خوبی انگریزی یا کسی اور زبان میں ڈھونڈی جائیگی۔ اس امر کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ کسی زبان میں ترجمہ کرتے وقت لفظی پابندی کا صریح نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو خیالات اصلی زبان میں نہایت پاکیزہ، دلچسپ اور سُلجھے ہوئے ہوتے ہیں دوسری زبان میں سے لطف یا

کم لطف ہوکر اُلجھ کر رہ جاتے ہیں۔ ہم معنی یا قریب المعنی الفاظ دُوسری زبانوں میں مل جاتے ہیں، مگر موسیقی، طرزِ ادا، حُسنِ صورت، وسعت اور اثرات میں ممتاز خصوصیتیں جُداگانہ طور پر پائی جاتی ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ محض دقتوں کی وجہ سے ترجمہ و اخذ سے ترکِ موالات کر لیا جائے۔ نہیں بغیر ان کے زبان و ادب میں وسعت و پختگی پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ اُردو کو اس بات کی نہایت درجہ ضرورت ہے کہ مختلف علوم و فنون کی کتابوں کے دلچسپ و صحیح و معنی خیز تراجم کئے جائیں اور دوسری مہذب و وسیع ادبیات سے عمدہ خیالات اخذ کر کے اپنی زبان میں رائج کئے جائیں۔ آج بیس پچیس برس سے فرمانروائے نظام حیدرآباد کی نظرِ توجہ، اراکین بزمِ ادب، دارالادب، ندوۃ العلماء، اور دارالمصنفین، وغیرہ کی انتھک اور انمول مشقتوں کی وجہ سے یہ بیش بہا کام بھی بہت تیزی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اور وہ دن دور نہیں جب اُردو زبان بجا طور پر فخر کر سکے گی کہ اُس کے پاس بھی علوم و فنونِ قدیمہ و مروجہ کا معتدبہ خزانہ موجود ہے۔ معاف کیجئے گا ذرا میں اپنی بحث سے کچھ دور ہو گیا تھا۔ اصل غرض یہ تھی کہ اگر دونوں زبانوں کی مخصوص خوبی کا صحیح و مکمل اندازہ نہ ہوگا تو موازنہ و مقابلہ بالکل بے ثمر ہوگا۔

تکمیل کی شرط

۶۔ زبان یا ادب کی تکمیل ایک دن میں نہیں ہوتی۔ اُردو کی نوعمری اور انگریزی کی کبرسنی کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ انگریزی زبان اُردو کے مقابلہ میں بہت پرانی ہے۔ دونوں میں کم سے کم ایک ہزار برس سے زیادہ کا فرق ہے۔ خیال تو فرمائیے کہ جس قدر

ترقیاں اُردو نے اپنی پیدائش سے چار صدی کے اندر کرلی ہیں اتنی ترقی انگریزی کو چار سو برس میں کب حاصل ہوئی تھی۔ گذشتہ سو برس کے اندر اُردو کا درجہ علمی، ادبی، سیاسی، مجلسی، ذہنی، اخلاقی اور ادبی حیثیت سے کیا سے کیا ہوگیا ہے۔ اور خبر رکھنے والے جانتے ہیں کہ حیدرآباد، پنجاب، مدراس، ممالک متحدہ، بمبئی، برما، آسام، پونا، جے پور، کشمیر، کوئٹہ اور راجپوتانہ میں تمام ایسی صورتیں پیدا ہوتی جارہی ہیں کہ لوگوں کو سیاسی انقلابات اور دَورِ زمانہ نے مہلت دی تو دو ہی تین صدی کے اندر اُردو ہندوستان کی عام زبان بن جانے کے علاوہ دنیا کی مستند و مستغنی زبانوں میں شمار ہونے لگے گی۔ اس کے ساتھ ہی مجھ کو اعتراف ہے کہ اُردو میں ابھی ایسے بہت سے علوم و فنون کی تصانیف موجود نہیں جن سے انگریزی کا دامن مالامال ہے۔ مگر نوجوانوں کی ہمت اور اہلِ قلم کی محنت کے سامنے اس کمی کا پورا کردینا کوئی بڑی بات نہیں۔ جہاں کہیں جو کام ہے بہت خوب ہورہا ہے۔ میں زندہ دلانِ پنجاب، انجمن ترقی اُردو، دارالمصنفین و دیگر تمام مجالس و افراد کی خدمت میں دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ خلوص کبھی ضائع نہیں ہوتا، محنتیں ہمیشہ ٹھکانے لگتی ہیں۔ لوگ مٹ جاتے ہیں مگر اُن کے نام نقش کالحجر ہوکر باقی رہتے ہیں۔ کاش ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں مفید انجمنیں قائم ہوجاتیں۔ میری یہ توقع بے محل نہیں ہے۔ اُمید افزا آثار پیدا ہوگئے ہیں اور ہر سال مختلف مقامات پر نئی انجمنیں یا شاخیں قائم ہوتی جاتی ہیں۔

خارجی اثرات | ۷۔ اُن تمام تاریخی، سیاسی، معاشرتی، ملکی اور قومی

حالات کو مدِّ نظر رکھنا چاہیے جو ارتقا و تنزل کے اسباب، علل ہوتے رہتے ہیں۔ اور اپنے اثرات سے بہت سی تبدیلیاں کرتے رہتے ہیں۔ ادب کی ترقی و تنزلی پر حالاتِ مشرحۂ صدر کی تاثیر بالکل ویسی ہی ہوتی ہے جیسی حیاتِ انسانی اور افرادِ ملک و قوم پر ہوتی رہتی ہے۔

غریب اُردو کو سیاسی سکون کبھی نصیب نہیں ہوا۔ ہوا بھی تو کچھ دنوں واجد علی شاہ کے محلات میں اُس کی خاطر مدارات ہوتی رہی۔ سلطنت کا اثر ادب و زبان پر بہت کچھ پڑتا رہتا ہے۔ خود انگریزی کو دیکھ لیجئے جب سے سلطنت کے سایہ میں آ گئی۔ چند دنوں میں یہ کیفیت ہو گئی کہ پہچانی نہیں جاتی۔ دنیائے ادب میں طرح طرح کے شگوفے کھلنے لگے۔ ادبا و شعرا کی خاطر خواہ قدر ہونے لگی۔ ہمتیں بڑھ گئیں۔ دل بڑھائے گئے۔ چمنستانِ ادب میں نئی نئی روشیں تیار ہونے لگیں۔ اور اب یہ عالم ہے کہ انگلستان تو انگلستان تمام حدود برطانیہ میں انگریزی عام زبان ہو گئی ہے۔ غریب اُردو کو دیکھئے اودھ میں کچھ دنوں پلی، خود میزبانوں کی حالت آفتابِ لبِ بام اور چراغِ سحری کی ہو رہی تھی۔ فطرت کو اُردو کا اتنا سکون بھی پسند نہ آیا اور اودھ کی سلطنت بالکل مٹ کر مٹی کے برابر ہو گئی۔ اُردو میں بیگمات کے روزمرہ محاورات و مصطلحات اس قلیل عرصہ میں بھی، اتنے بیش بہا معنی خیز دل فریب اور کثیر التعداد ہو گئے تھے کہ اور زبانوں کے خزینہ میں اُس کی مثال نہیں ملتی۔ بالکل یہی حالات معاشی، ملکی، علمی، قومی، مدنی، تاریخی، واقعات کے اثر کے ہیں۔ اگر آپ غور سے دیکھیں گے تو صاف پتہ چل جائے گا کہ گذشتہ نوسے

برس کے اندر یورپ اور خصوصاً انگلستان میں تمام متذکرہ بالا تبدیلیاں انگریزی کے لئے مفید ہوتی رہی ہیں۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں بہت کم تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اور جو ہوئی بھی ہیں۔ انھوں نے نشوونما میں کافی مدد نہیں دی۔ سودیشی تحریکات، سیاسی شوروغل، یا دیگر قومی فریاد بے اثر کی داستانیں دُہرانا تحصیل حاصل ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ان تمام موانع اور صبر آزما حالات میں رہ کر اُردو نے آج کس قدر ترقی کرلی ہے۔

طرزِ موازنہ ۸۔ ادب کے تمام شعبوں کی واقفیت ہونی ضرور ہے تاکہ دونوں زبانوں کے موازنہ میں کسی قسم کا کوئی اعزازی، امتیازی، امکانی، مشترک، متجانس یا مخالف پہلو چھوٹ نہ جائے۔ اور یہ نہ ہو کہ ایک کی نثر کا مقابلہ دوسرے کی نظم سے کیا جائے۔ یا ایک کے ڈرامہ کی شان دوسرے کے مختصر افسانہ میں دیکھی جائے۔

تنقید ۹۔ نتائج پر پہنچنے کے لئے خود اپنی رائے اور اپنی تنقیدی نگاہ سے کام لینا چاہیے۔ غیروں کی زبانی کسی فیصلہ پر پہنچنا بہت خرابی کا باعث ہے۔ اسی لئے ماہرین علم النفس و ماہرین تعلیمات آج اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ محقق و مبصر کو نہ صرف ایسی تصانیف و تالیفات کے مطالعہ پر کوئی رائے قائم کرنی چاہیے جو کسی زبردست مصنف کے متعلق دنیا کے زبردست لوگوں نے لکھی ہوں بلکہ نکتہ شناس حضرات کو خود مصنف کے تمام حالات و تصنیفات سے پوری پوری واقفیت حاصل کرنی چاہیے۔

ان چند سطور سے صاف ظاہر ہوگیا ہوگا کہ :۔

اُردو کا موجودہ سرمایہ بُرا نہیں ہے

۱۔ اُردو اگرچہ انگریزی کی، مقابل نہیں ہے مگر جس قلیل عرصۂ حیات اور جن مختلف حالات کے زیر اثر اِس نے نشوونما پائی ہے وہ صرف انگریزی ہی کے لئے نہیں۔ یورپ کی تمام زبانوں کے واسطے قابل رشک ہے۔

بعض مخصوص جواہر موجود ہیں

۲۔ اُردو میں بھی باوجود نسبتی بے بضاعتی کے بہت سے مخصوص جواہر موجود ہیں۔

آثار اچھے ہیں

اُردو کی ترقی کے آثار بہت اچھے ہیں اور کیا عجب ہے کہ پانچ سات صدیوں کے بعد اگر انگریزی سے بڑھ نہ گئی تو اس سے کم بھی نہ رہ جائے گی۔

تحقیق و تدقیق کی ضرورت

جس طرح ہندوستان اپنے معدنیات، برقیات، اور اشیائے خام کے اعتبار سے ایشیا اور یورپ میں بہترین فطری خزینہ ہونے کا دعویدار ہے اُسی طرح فلسفہ، رمل، نجوم، ہیئات، ریاضیات، نالکا بھید، کوک، سرودھ، علویات، سفلیات وغیرہ وغیرہ دنیا کے اکثر علوم و فنون متداولہ و گذشتہ کے علاوہ بھارت ماتا کے بہت سے مخصوص علوم قدیمہ کا سینہ بہ سینہ رازدار ہوتا آیا ہے۔ ضرورت صرف اسی بات کی ہے کہ دُھن کے پکّے اور ہمت کے دھنی احباب موشگافیاں کریں، انتھک ہو کر ڈٹ جائیں اور جسدہائے مُردہ میں اپنی مسیحا نفسی سے نئی روحیں پھونک دیں۔

ترقی کے وسائل

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ادب اُردو کے خزانہ

کی تکمیل محض شعراء متخیلین اور منمین ہی پر نہیں ہے، ملک کی آزادی، سائنس کے کرشمے، علوم و فنون کا احیاء، ہم وطنوں کی فارغ البالی، اور دیگر سیاسی، مدنی، معاشرتی آسانیاں سب کی سب ضروری ہیں۔ اس کے علاوہ اخوت و یک دلی۔ برادرانہ تعلقات اور متحدہ و مجتمعہ بے لوث کوششیں ارتقاء ادب کے لئے ضروری عناصر ہیں۔

اتحاد ادب اور زبان میں دامن اور چولی کا ساتھ ہے اور اتنا گہرا تعلق ہے کہ اکثر حضرات دونوں کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں اور دونوں کو ہم معنی الفاظ کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ واقعی امر یہ ہے کہ دونوں فی نفسہٖ ایک دوسرے میں مدغم ہیں۔ زبان اور ادب کی یہ حالت ہے کہ ایک جان ہے تو دوسرا قالب۔ ایک آنکھ ہے تو دوسرا نگاہ۔ دونوں میں اکثر خوبیاں مشترک ہیں۔ اگرچہ بعض پہلو امتیازی

فرق دونوں اظہار خیال کا ذریعہ ہیں۔ ادب کے ذریعہ خیالات کا اظہار اسی طرح ہوتا ہے جیسے زبان کے وسیلہ سے ہوتا ہے۔

زبان کے لئے نطق، صوت، تکلم، اور زبان قلم ضروری آلات ہیں۔ زبان کیا ہے الفاظ و اصوات کا مجموعہ ہے۔ خواہ اس سے سننے والے کے کان مزے اٹھائیں یا پڑھنے والے کی آنکھیں منوّر ہوں۔ ادب بھی الفاظ و اصوات کا مجموعہ ہے۔ خواہ صفحات کاغذ پر اس کے نقوش جاذب نگاہ ہوں یا سطح دماغ پر اس کی تصویریں اتاری جائیں۔

اثرات دونوں کے اثرات بھی یکساں ہیں جس طرح خوش گو، خوش لہجہ

خوش تقریر اور خوش آواز مقرر اپنے جس لفظ میں جو اثر پیدا کرنا چاہتا ہے پیدا کر دیتا ہے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ بعض مقرر ایسے سحر بیان ہوتے ہیں کہ حاضرین جلسہ کو جب چاہا رلا دیا یا جب چاہا ہنسا دیا، جب چاہا غصہ و نفرت کے جذبات مشتعل کر دیے۔ جب چاہا رحم و مروت، شرم وحیا، غیرت و وفا، صدق و صفا سے قلوب کو بھر دیا۔ یہی حال اعلیٰ درجہ کے ادیب کا ہے۔ وہ زبان، لہجہ اور موسیقی کا کام نشست الفاظ، حسن بندش اور توازن اجزا سے لیتا ہے اور پڑھنے والے کے دل و دماغ میں جو اثر منتقل کرنا چاہتا ہے وہی منتقل کر دیتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہر شخص پر یکساں اثر نہیں ہوتا۔ کوئی کم متاثر ہوتا ہے کوئی زیادہ۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ادیب یا مقرر کے سحر الفاظ میں کوئی کمی یا نقص ہے۔ نہیں بلکہ مختلف طبائع کا معیار استعداد جداگانہ ہے۔

اب امتیازی پہلو ملاحظہ فرمائیے۔

تعمیر زبان زبان کس طرح بنتی ہے؟ جب انسان کو تبادلہ خیالات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اُس وقت کچھ آوازیں معنی دار بن جاتی ہیں کیسے؟ کثرت استعمال اور عام قبولیت کی وجہ سے۔ یہ معنی دار آوازیں، پہلے حروف، اس کے بعد الفاظ، اس کے بعد فقرات میں تبدیل و معین ہوتی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر لفظ کے معانی ایک خاص حد تک معین ہیں۔ ورنہ گفتگو یا تحریر کے وقت کوئی صورت ایسی نہیں ہو سکتی جس کی بدولت آپس میں تبادلہ خیالات ہو سکے۔ فرض کیجیے قلم کے معنی ایک خاص

حد تک متعین نہ ہوں تو زید قلم سے قلم، بکر قلم سے گھوڑا۔ عمرو قلم سے اونٹ سمجھنے لگے۔ تو آپ ہی بتائیے۔ کون کس کی سمجھے گا۔ بہرطور زبان انسانی ضروریات زندگی اور ارتقاء معیار معاشرت کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی رہتی ہے، یہانتک کہ تحریر و نقوش کی شکل میں آجاتی ہے۔ اصول و قواعد بن جاتے ہیں۔ تقطیع و عروض کی داغ بیل پڑ جاتی ہے۔ کلام و لسان کا دربار سجایا جاتا ہے۔ محاورات و مصطلحات، ضرب الامثال، محاکات، روزمرہ، صرف و نحو، تعریف و تنقید سبھی کچھ حاضر دربار ہونے لگتے ہیں۔ استداد زمانہ کے ساتھ ساتھ مدنی اور سیاسی علوم و فنون۔ غرض قومی ترقی اور تنزل کے دوش بدوش اس میں بھی ہبوط و صعود ہوجاتا ہے۔ ایک ہی خیال کے لئے کئی کئی لفظ پیدا ہوجاتے ہیں۔

"اگر غور سے دیکھئے تو کسی زبان میں کوئی دو لفظ مرادف یا ہم معنی نہیں ہوسکتے"، یہ ممکن ہے کہ وہی خیال ایک سے زیادہ الفاظ میں ادا ہوسکے: مگر ہر لفظ میں کوئی لطیف و مخصوص خوبیاں ہوتی ہیں۔ مثلاً نوازش، عنایت، مہربانی، کرم، احسان، لطف، قریب المعنی تو ہیں۔ مگر ہر لفظ کے معنوی شان، خاص اثر، مخصوص موسیقی جدا جدا ہے اور محل استعمال بھی مخصوص و مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو مقرر ان میں فرق و امتیاز نہیں کرسکتا وہ کامیاب نہیں ہوتا۔

علم اللسان ان کا فرق آسان نہیں، اسی فرق کے لئے اور ہر لفظ کی مکمل تاریخ یعنی پیدائش۔ نشو و نما۔ استعمال، اثرات، ازدواج،

مشتقات اور مفاہیم مختلفہ کی تحقیق کے لیے ایک مستقل فن ہے جس کو ہم علم اللسان کہتے ہیں۔

فرائض ادیب ادیب کا سب سے پہلا فرض اور ادب کا اہم ترین جوہر یہی ہے کہ مذکورہ بالا امتیازات خفی و لطیف سے پورا پورا آراستہ ہو۔ کوئی لفظ کیا، حرف کیا، نقطہ بھی اپنی جگہ سے بال کے برابر ہٹ کر استعمال نہ ہو۔ اس طور سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ ادب کی پہلی منزل وہ ہے جو زبان کی آخری منزل ہے۔ اب دوسرا نکتہ ملاحظہ فرمائیے۔ یہ ضروری نہیں کہ زبان داں ادیب بھی ہو مگر یہ لازمی ہے کہ اچھا ادیب مکمل زباندان ہو، یہی وجہ ہے کہ ادب ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ زبان رہے یا نہ رہے، ادب کا تعلق خیالات و محسوسات، مدرکات اور تصورات سے زیادہ ہے اور چونکہ انکے اظہار کے لیے زبان ضروری ہے۔ لہذا ادب کا تعلق بھی زبان کے ساتھ اُسی حد تک ہے جس حد تک زبان اُن کے اظہار کا ہے۔ اس طور پر زبان، ادب کا ایک جزو ہے اور نہایت ضروری جزو، مگر جزو کسی حالت میں کل کے برابر نہیں ہو سکتا۔

تعلق یہ صحیح ہے کہ کتابی صورت میں ادب اور زبان کا فرق بہت لطیف ہو جاتا ہے مگر اصلاً اور بنفسہٖ دونوں کی حیثیات فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے ممتاز ہیں۔ زبان محض آلۂ اظہار ادب ہے۔ اسکا کوئی لاینفک جزو نہیں۔ روز مرہ، محاورات، محاکات، مصطلحات، ادب کے اجزا ثانوی ہیں۔ ان باتوں سے کہیں آپ کو یہ خیال پیدا ہو جائے

کہ زبان اور ادب میں کسی قسم کا کوئی تضاد یا تخالف ہے۔ نہیں
دونوں میں "لفظ و معنی" کی طرح ارتباط و اتفاق ہے۔

زیادہ آسان لفظوں میں یوں سمجھ لیجیے کہ ہر ادبی چیز میں اچھی سے اچھی زبان ہوگی مگر یہ ضروری نہیں کہ جو چیز زبان کی حیثیت سے عمدہ ہو وہ ادبی نقطۂ نگاہ سے بھی قابل قدر ہو۔ عمدہ زبان داں ہونے کے لیے اہل زبان کی صحبت، علم لسان و قواعد عروض وغیرہ سے واقفیت، سیر و سیاحت، مناظر فطرت کی سیر، گفتگو اور شرکت مجالس اور مطالعہ کتب ضروری ہیں، مگر ادیب ہونے کے لیے ان سب چیزوں کے علاوہ فطری قابلیت اور داخلی جوہر، تخیل، تجزیہ، تجربہ، استغراق، فلسفہ، تصوّر، تبحّر، مطالعہ علوم و فنون، حسن اخذ استعداد، استقلال، زور بیان سب کچھ ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ درگاہ ادب میں زبان کے بہت سے مایۂ ناز پھول نہیں چڑھ سکتے۔ ہم ایک ہی خیال کو اپنی زبان میں مختلف فقروں سے ادا کر دیتے ہیں جن میں کا ہر فقرہ بعض وقت قواعد و اصول کے معیار پر پورا اترتا ہے اور سمجھ میں بھی آجاتا ہے مگر ادب میں صرف وہی فقرہ انتخاب میں آتا ہے جس میں ایجاز، معنی خیزی، صحیح موسیقی، پاکیزگی خیال اور صحت مفہوم کے عناصر اور تمام فقرات کی نسبت سے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

بقائے ادب کے امتیازی درجات

بقائے ادب میں بھی امتیازی مدارج ہیں۔ بہت سی چیزیں لکھی ہوتی ہیں مثلاً اخبار و مجلات و رسائل، سفرنامے، یا دیگر حالات حاضرہ کے متعلق نظم و نثر۔

بہت سی چیزیں ایک خاص مدت تک ایک مخصوص دور تک باقی رہتی ہیں۔ مثلاً بہت سے ہندوستانی شعرا اور ادبا کی تصانیف اور ایک وہ جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہیں اور زندہ رہیں گی۔

آپ بھی اس قسم کی دوچار تصانیف سے واقف ہوں گے۔ بہرکیف عرض کرنے کا حاصل یہ تھا کہ ادب جو اصلی معنوں میں ادب ہے ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ اس واسطے کہ وہ حیات ادیب کا خالص جوہر ہے اور جس طرح روح کو موت نہیں، فنا نہیں، اسی طرح ادب کو بھی فنا نہیں، موت نہیں۔ دنیا کے اکثر ادبیات اس وقت اپنی زبانوں میں موجود نہیں، مگر دیگر کثیر زبانوں میں محفوظ و باقی ہیں۔ شاید ان تمام تشریحات کے بعد یہ بتادینا ضروری نہیں کہ ادب و زبان جسم و جان کی طرح ہیں مگر بنفسہٖ ایک چیز نہیں ہیں۔

ادب اور کتاب

تعلق ادب اور کتاب میں وہی تعلق ہے جو آئینہ اور جوہر آئینہ میں ہے۔ ادب بنفس خود نہایت لطیف غیر مرئی اور غیر محسوس ہے کتاب کے اثر میں آکر ادب کی شان کچھ اور ہوجاتی ہے، وہ محسوس ہونے لگتا ہے، آنکھوں سے دکھائی دیتا ہے، ہاتھوں سے چھوا جاسکتا ہے۔ ادب کے مدارج چاند کے منازل کی طرح ہیں وہ جب کتابی منزل میں آجاتا ہے اُس وقت چودھویں کا چاند ہوجاتا ہے جس سے ہر طرف پھوٹ کر

کرنے نکلنے لگتی ہیں اور یہ کرنیں صرف کم نظروں کی بصارت کو بڑھاتی ہی نہیں بلکہ جن اندھوں کی آنکھ پر جہالت کے پردے پڑے رہتے ہیں اُن کو بھی اُٹھا دیتی ہیں۔ ایک نہایت معمولی سی مثال ملاحظہ فرمائیے۔ ذوق مرحوم فرماتے ہیں۔

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات ہنس کر گذار یا اُسے رو کر گذار دے

صاف ظاہر ہے کہ یہ شعر یکایک کسی معجزہ یا سحر کے ذریعہ سے آپ سے آپ اسی صورت میں صفحۂ کاغذ پر نہیں آگیا بلکہ مختلف مدارج طے کر کے مختلف منازل قطع کر کے یہاں تک پہنچا ہے۔

ادب کی منازل

۱۔ پہلی منزل وہ تھی جب فلسفۂ حیات کی مدد سے، روزانہ زندگی کے تجربے سے، قوت استقرار و حاسہ و مدرکہ مطالعۂ فطرت، اور تجزیہ نظریات سے شاعر کے دماغ میں "حدود حیات فطری" کا خیال آیا، ابھی یہ خیال اپنے انتہائی لطیف درجہ میں تھا جہاں نہ الفاظ تھے نہ حروف، ایک کیفیت تھی، جو پیاس یا مسرت کی طرح روح کو محسوس ہو رہی تھی اور ساری دنیا اس سے بے خبر تھی کہ شاعر کے دماغ میں کیا ہے۔

۲۔ اب قوت ممیزہ اپنا اثر دکھاتی ہے۔ شاعر تجزیہ و تفکر سے کام لے کر صفحۂ ذہن پر اُس لطیف کیفیت کی ایک صورت بنا لیتا ہے کیفیت خیال سے بدل جاتی ہے۔

۳۔ اس کے بعد اُسے شمع کا خیال آتا ہے۔ جو شام سے صبح تک رو کر اپنی عمر کاٹ دیتی ہے۔ پھر پھولوں کا دھیان ہوتا ہے جو مُسکرا مُسکرا کر

ہنس ہنس کر اپنی حیات کو بسر کر دیتے ہیں۔

۴۔ اب شاعر کو فطرت انسانی اور مقتضائے طبیعت کا گہرا مطالعہ بتا دیتا ہے کہ انسان اپنی مسرت کی دنیا یا غم و الم کا عالم خود سے بناتا ہے اور جس طور سے چاہے اپنی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ بعض لوگ ذرا ذرا سی پریشانیوں میں ایسے مضطرب ہو جاتے ہیں کہ سنبھالے نہیں سنبھلتے اور برخلاف اُن کے بہت سے خطرات مشکل سے مشکل اوقات میں بھی خندہ نوازی اور تبسم و خوش طبعی سے باز نہیں رہتے۔

۵۔ آخری منزل سب سے زیادہ کٹھن ہے۔ شاعر کا خیال مکمل ہو چکا اور اظہار کے لئے بے چین ہے۔ اس نے حیات طبعی و غیر طبعی میں فرق بھی کر لیا۔ تشبیہات مناسب بھی ڈھونڈھ لیں۔ اب الفاظ کی ضرورت ہوئی اور جب الفاظ بھی مل گئے تو دست و قلم کی جنبشوں سے یہ شعر لوحِ دماغ سے صفحۂ کاغذ پر آگیا۔

شاید آپ کو ان منازل کی صحت یا ترتیب میں کچھ شک ہو اگر ہو تو مجھے تعجب نہ ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ بعض اوقات یہ تمام منزلیں اس قدر جلد طے ہو جاتی ہیں کہ شاعر کو خود اِن کا احساس نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ ضرورت و موقع، مشق و تجربہ کے ساتھ ساتھ اُن کی ترتیب بھی بدلتی رہتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ذوقؔ مرحوم کے دماغ میں یہ خیال کسی مادی شمع کو جلتے ہوئے دیکھ کر پیدا ہوا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ محض شمع کے جلنے کا خیال آیا ہو۔ اب رہی یہ بات کہ واقعی نظم کرتے وقت شاعر ان تمام منازل سے

وقفہ اوقات یا سرعت کے ساتھ گذرتا ہے یا نہیں؟ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ ایک لفظ بولتے میں لب، زبان، گلا، پھیپھڑا، دل، کان اور دماغ کے سیکڑوں اعصاب و سرایئں خاص طور پر اور تمام جسم کے بے شمار اجزاء عموماً متاثر و متحرک ہوتے ہیں۔ یہی حال ایک حرف کیا معنی ایک نقطہ کے لکھنے میں واقع ہوتا ہے۔ جب یہ ہے تو آپ ان تمام اثرات و تحریکات کو محسوس کیوں نہیں کرتے ہیں۔

ادب اور کتاب اب تو غالباً یہ بات دُہرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ادب اُسی وقت درجۂ بقا و تکمیل تک پہونچتا ہے جب کسی محسوس حالت تک پہنچ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب نہایت مہتم بالشان ہوجاتی ہے، خود صفحات میں یا حروف میں یا روشنائی میں کوئی چیز نہیں ہوتی جو کچھ ہے ادب کی بدولت ہے یعنی وہ جوہر جو اُن حرفوں میں بند رہتا ہے۔

ادبی کتابیں مگر جس طور پر ہر فقرہ ادب نہیں، اُسی طرح ہر کتاب ادب نہیں۔ حلقۂ ادب میں وہ کتابیں اور صرف وہی کتابیں شامل ہیں جو اپنے پاکیزہ موضوع اور مؤثر طرز بیان کے اعتبار سے عام دلچسپی کا سامان ہوسکیں۔

دلکشی یوں تو دنیا کی ہر کتاب میں ادب کچھ نہ کچھ پایا جاتا ہے مگر کچھ تصانیف ایسی ہیں جو خالص ادبی ہوتی ہیں جو انسان کے دل و دماغ کا بہترین جوہر ہوتی ہیں اور اُن میں دل کشی اور موہنی کوٹ کوٹ کر بھری رہتی ہے۔

عام اور عوام کا فرق

ہاں یہ بھی مدنظر رہے کہ عام اور عوام میں بہت فرق ہے۔ یہاں عام دلچسپی سے مُتبذل مذاق یا سوقیانہ پسند مراد نہیں ہے۔ سطحی نظر رکھنے والے یا بازاری پسند والوں کا معیار عام سے قطعی جُدا ہے۔ یہاں عام سے عالمگیر مراد ہے جو نعمِ فطری یعنی ہوا و باراں یا موسم ہائے گرم و سرد کی طرح کسی ایک ملک و قوم کا حصّہ نہیں ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ایک ملک و قوم کا ادب دوسرے ملک و قوم میں کبھی بہت زیادہ مقبول ہوتا ہے کبھی بہت کم۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ مکمل ادب میں کوئی خرابی ہوتی ہے نہیں۔ یہ استعداد اخذ و قابلیت لطف اندوزی پر موقوف ہے جس طرح سورج ایک ہے مگر مختلف زمینوں پر اُس کا اثر مختلف ہوتا ہے۔ اسی طرح دنیا کا ادب بنفسہٖ ایک ہے۔ مختلف اوقات و اسباب میں اس کا اثر مختلف ہوتا ہے۔ ادب کی وسعت، بیان سے باہر ہے۔

اس کا دائرہ کسی خاص صنف، موضوع، علم یا فن تک محدود نہیں۔ بلکہ آئینہ خانہ کتب میں اسی ایک شمع کا جلوہ ہر جگہ ہے۔

عالمگیر دلچسپی

دنیا کے محققین اور ناقدین فن نے ہر زمانہ میں اس امر خاص کی نسبت بہت زیادہ اختلاف آرائی سے کام لیا ہے کہ احاطۂ ادب میں کن اقسام کی کتابیں شامل ہیں اور کون سی کتابیں اس سے باہر ہیں مگر اس معاملہ میں سب کا اجماع و اتفاق ہے کہ ادب میں ہر ایسی کتاب شامل ہے جو اپنے پاکیزگی خیال اور نظم و بیان کی خوبیوں سے

عالمگیر دلچسپی پیدا کر سکتی ہو' یعنی جو کسی خاص طبقہ و جماعت' فرقہ و قبیلہ کے
مذاق دلپسند تک محدود نہ ہو۔

ادب اُردو | اُردو میں اس قسم کی کتابیں اگر بہت زیادہ نہیں تو بہت کم بھی نہیں۔ ہندوستانی اکاڈمی کی حسب تجویز ان تمام کتابوں کی ایک فہرست تیار ہو رہی ہے جو اُردو میں اب تک لکھی گئی ہیں۔ محققین کوشش کر رہے ہیں کہ مطبوعہ و قلمی تمام نسخہ جات کی فہرست تیار ہو جائے۔ ابھی تک یہ فہرست مکمل نہیں ہوئی مگر جہاں تک تیار ہو چکی ہے اُس پر نگاہ ڈالنے سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ دواوین' کلیات۔ ناٹک۔ قصص و فسانے۔ ناول۔ تذکرے وغیرہ کثرت کے ساتھ موجود ہیں اور اکثر اس قسم کے کارنامے ہیں جو خالص ادبی کہے جا سکتے ہیں۔ عالمگیر دلکشی رکھتے ہیں۔ مذاق صحیح کے معیار پر ٹھیک اترتے ہیں اور تمام صوری و معنوی خوبیوں سے مالامال ہیں کہیں یہ خیال نہ فرمائیے گا کہ میں خوش اعتقادی یا اُردو پرستی سے کام لے رہا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ اُردو میں بھی بہت سی ایسی کتابیں ہیں جو نہ ہوتیں تو بہت اچھا تھا مگر کس زبان یا کس ادب میں ایسی کتابیں نہیں ہیں۔

ادب کی ضرورت

ادب مطلق | اِس جگہ ادب سے مراد' ادب مطلق ہے جو حدود قوم و ملک اور قیود زمانہ و طبقے سے آزاد ہے۔ اِس ضرورت کا احساس مختلف عنوان سے ہو سکتا ہے۔

تکمیل حیاتِ انسانی

۱۔ اوراقِ گذشتہ کی سیر سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ تکمیل حیاتِ انسانی اور تکملہ تمدن و معاشرت کے لئے ادب ناگزیر ہے اور مقتضائے فطرتِ بشری ہے کہ نطق و کلام منازل طے کرتے کرتے ادب کے درجہ تک پہنچ جائیں جس کی توضیح ابواب گذشتہ میں کردی گئی ہے۔

ادب نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟

۲۔ نفی کے پہلو سے اثبات کی شان دیکھنی چاہیئے۔ اس لئے کہ ہر چیز کی قدر تعرف الاشیاء باضدادہا سے ہوتی ہے۔ اگر تکلیف نہ ہوتی تو آرام کی قدر کون کرتا، اگر رنج نہ ہوتا تو خوشی کیا ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ "قدرِ مردم بعدِ مردن" ایک زمانہ سے ہمارے ضرب الامثال میں داخل ہو گیا ہے۔ اسی کلیہ کی بنیاد پر یہ خیال کیجئے کہ اگر ادب نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟

میں مانتا ہوں کہ اس سوال کا جامع جواب نہایت مشکل ہے۔ جس شخص میں جس قدر متاثر ہونے کی قابلیت ہے اس کے لئے میرا جواب اتنا ہی تشفی بخش ہوگا۔ میں جواب دیتے وقت کوشش کروں گا کہ متوسط حضرات کے جذبات کا خیال رکھوں اور اعلیٰ ترین و ادنیٰ ترین طبقات کو اپنا معیار بناؤں۔ دنیا کی تاریخیں اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ جب تک ادب نہ تھا کچھ بھی نہ تھا۔ نہ حفاظتِ خیالات کا ذریعہ تھا نہ نشرِ تہذیب کی راہیں تھیں۔ دنیا کا کام کبھی بند نہیں رہا۔ مگر ادب نہ ہوتا تو ہم آج جس قدر ترقی کر چکے ہیں نہ کر سکتے۔ نہ اصول مقرر ہو سکتے نہ قوانین مرتب ہوتے۔ نہ سائنس کی ترقی

ہوسکتی۔ نہ علوم و فنون کا پتہ ہوتا۔ نہ تواریخ و سیر کی سیر سے آنکھیں روشن ہوتیں۔
میں اس بحث کو ختم کردینا چاہتا ہوں اس لئے کہ ایسے ازمنہ کی خیالی تصویر کھینچنا بہت سے دماغوں کے لئے ناممکن ہے۔

قواعد ادب - بقائے خیال

۳۔ ضرورت یہ ہے کہ اِس کے فوائد پر نگاہ کی جائے۔
الف۔ ادب بقائے خیال کے لئے ضروری ہے۔ اگر دُنیا میں کتابوں کا جلوہ نہ ہوتا تو ہم کسی علم یا فن میں ترقی نہ کرسکتے۔ کتاب ہی وہ چمن ہے جہاں ہم سے پہلے والے اپنے تجربہ و تحقیق کے پودے لگا گئے ہیں۔ جن کی سیر سے ہماری تمام ذہنی قوتوں میں نئی رَو دوڑ جاتی ہے۔ اور جہاں ہم خود اپنے تجربات، ایجادات، معلومات اور اکتشافات کے تازہ تازہ نہال بٹھائے جاتے ہیں تاکہ یہی سلسلہ نسل درنسل باقی رہے۔ دُنیا کی مدنی، معاشرتی، علمی یا کوئی تاریخ اُٹھاکر دیکھ لیجئے جب تک تحریر کا فقدان تھا۔ عالم کے کسی گوشہ میں مستقل ترقی کا خیال بھی خواب نوشیں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا تھا۔ شاید اس جگہ کسی کو یہ شک ہو کہ کتاب کے فوائد سے ادب کے منافع کا کوئی علاقہ نہیں۔ مگر اِس خیال کی بنیاد نقش برآب ہونے سے زیادہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ کتاب کیا چیز ہے۔ ادب کا نقش مادی ہے، جو صفحات کاغذ پر قلم کے ذریعہ سے کھینچ دیا جاتا ہے۔

ایک نکتہ اور ملاحظہ فرمائیے۔ ہمارا دماغ جزیرۂ برقیہ کی صورت ہے۔ اور خیالات بجلی کی لہریں ہیں۔ دماغ کسی وقت خیالات سے خالی نہیں

رہ سکتا۔ مگر کوئی خیال نہ تو قائم رہتا ہے نہ دوبارہ پیدا ہوتا ہے۔ ادب ہی وہ چیز ہے جو پسندیدہ خیالات پر اپنی مہر لگا کر صفحاتِ کاغذ کے حوالے کر دیتا ہے اور ضرورت کے وقت باصرہ یا سامعہ یا حافظہ کی مدد سے اُس خیال کی ذہنی تصویر دماغ میں دوبارہ کھینچ دیتا ہے۔

تحلیل تصوّر ب۔ ادب تحلیل تصوّر کا ذریعہ ہے۔ جس طرح خیالات بے شمار ہیں اور دیرپا نہیں ہیں اُسی طرح ہمارا تصوّر کبھی مفرد نہیں ہوتا ہمیشہ مرکب ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم کسی آدمی کو کچھ لکھتے ہوئے دیکھتے ہیں تو دماغ میں ہر جزو کا تصوّر تدریجی یا جداگانہ طور پر نہیں پیدا ہوتا۔ یعنی پہلے آدمی کا تصوّر، پھر عملِ تحریر کا تصوّر، پھر آلۂ تحریر کا تصوّر، پھر معمولِ تحریر کا تصوّر نہیں ہوتا بلکہ صفحۂ کاغذ یا کسی چیز پر قلم سے لکھتے ہوئے آدمی کا واحد مگر مرکب تصوّر ایک ساتھ ہوتا ہے۔ ادب کی مدد سے ہم اس مرکب تصوّر کی تحلیل اُس کے تمام اجزائے ترکیبی میں کر سکتے ہیں، تاکہ قرار واقعی انداز سے ہر جزو کا مطالعہ و مشاہدہ کر سکیں اور اُن کے درمیان نظام و علائق کے اسباب و علل معلوم کر سکیں۔

تحلیل کی ضرورت یہ ہے کہ جیسے مادّی چیز کی ماہیت و حقیقت سے اُس کے اجزا کے مکمل مطالعہ و مشاہدہ کے بغیر واقف نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح کسی تصوّر کی پوری خوبیوں سے اُس وقت تک واقف نہیں ہو سکتے۔ جب تک اُس کے تمام اجزا کے تفصیلی حالات سے واقف نہ ہو جائیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ فرمائیے کہ سائنس اور طب کے روز افزوں معجزات

و انکشافات کی بنا کیا ہے۔ یہی تحلیل کُل اور تشریح اجزاءِ عمل میں، زندہ یا مُردہ یا بے ہوش یا بے حس حیوانات یا نباتات چیرے پھاڑے جاتے ہیں رگ، ریشہ، گوشت، پوست، استخوان، جھلی، غضروف، دست و پا، دل و جگر، ریہ، معدہ، غرض تمام اعضا و جوارح، ہڈیاں اور نسیں، جھلیاں اور غلاف وغیرہ کا گہرا مطالعہ و مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ اُن پر تمام ممکن پہلوؤں سے مختلف حالات و اثرات کے تحت ہیں تجربات کیے جاتے ہیں۔ اس تمام دردسری اور دماغ سوزی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصلیت ایک حد تک سمجھ میں آجاتی ہے اور یہ تجربات بیماریوں کے دفع کرنے یا صحت کے برقرار رکھنے میں امرت اور تریاق کا کام دیتے ہیں۔ اسی طرح تحلیل تصور سے اُس کی برائیاں، خوبیاں، اثرات نیک و بد سب کچھ سمجھ میں آجاتے ہیں۔

تنظیم و تصور

۳۔ ادب تنظیم تصورات کی جان ہے۔ یہ تو پہلے ہی عرض کیا جاچکا ہے کہ دماغ میں ہر لحظہ بے شمار خیالات، آتے اور گذرتے رہتے ہیں جن میں نہ کوئی تنظیم ہوتی ہے نہ ترتیب۔ اس مطلب کی توضیح مطالعہ باطن سے ہوتی ہے۔ ذرا سا غور فرمائیے تو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ ہر سانس کے ساتھ کس قدر مختلف النوع خیالات دماغ میں آتے اور گذر جاتے ہیں۔ مگر ادب ہی وہ ناظم ہے جو ہجوم افکار میں ترتیب اور کثرتِ خیالات میں سکون و نظم پیدا کر دیتا ہے۔

تبادلۂ خیالات

۴۔ ادب تبادلۂ خیالات کا مستقل ذریعہ ہے، ہاتھ کی حرکتیں، آنکھ کے اشارے، اعضاءِ جسم کی جنبشیں

بعض وقت الفاظ سے زیادہ معنی خیز ہوتے ہیں۔ مگر اُن کے اظہار میں عالمگیری استقلال یا قیام نہیں ہوسکتا۔ جو الفاظ گفتگو کے وقت زبان سے ادا ہوتے ہیں اُن میں نطق و تکلم کی بدولت نسبتاً زیادہ سریع الفہمی اور پائداری آجاتی ہے مگر جو الفاظ تحریر میں ضبط ہوجاتے ہیں وہ اپنے مقام پر مستقل اور غیر فانی بن جاتے ہیں۔

یہ چاروں فوائد جس طرح دنیا کے کسی ادب کے لئے ضروری ہیں اُسی طرح ادب اُردو کا وجود نہ ہوتا تو آج وہ سیاسی، مدنی، معاشرتی، علمی، طبی، صنعتی، زراعتی یا ایسی ہی وہ تمام باتیں جن کے نشر و اظہار کا شرف اُردو کو حاصل ہے ہم کو نصیب بھی نہ ہوتیں۔

یہ سچ ہے کہ ادب اُردو میں بہت سے خیالات، محاورات، ضرب الامثال، تراکیب اور الفاظ غیر زبانوں سے لئے گئے ہیں۔ مگر بہت سی خاص باتیں ہیں جو اُردو کی اپنی ہیں اور جو ہماری معلومات میں گراں قدر حصہ لیتی ہیں اس کے علاوہ دنیا کا کون سا ادب ہے جو بالکل خالص ہونے کا دعویٰ کرسکے۔ حقیقت یہ ہے کہ ادب مطلق کی حالت بالکل ایک جیبی گھڑی کی طرح ہے۔ اور دنیا کے مختلف علوم و فنون اُس گھڑی کے مختلف پُرزے ہیں۔ ہر پرزا بہ حیثیت خود سب سے جُدا ہے مگر سب کا محتاج بھی ہے۔

ادب اُردو کا رسم الخط اور اعراب

ملکی فضا۔ آج کل انجمنوں، اخباروں، صحبتوں اور رسالوں میں اُردو کے

موجودہ رسم الخط یا طرز تحریر پر شد و مد کے ساتھ بحث و مباحثے ہو رہے ہیں اور ملک کی تمام ادبی فضا حامیان و مخالفین کے تردیدی یا تائیدی نعروں سے گونج رہی ہے۔

مختلف مشورے

بعض حضرات کمی حروف پر زور دیتے ہیں۔ اِن کے نظریہ کے مطابق صرف مختلف الصوت حروف کو زندہ و باقی رہنے کا اختیار ہے۔ مختلف الصوت یا متشابہ الصوت حروف مثلاً ز، ذ، ض، ظ میں صرف ایک باقی رہ جائے یا ح، ہ، یا ط، ت میں صرف ہ اور ت باقی رہیں۔ میں ایسے حضرات سے با ادب گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ وہ تصویر کے تاریک رُخ کی طرف بھی توجہ فرمائیں۔ اُردو کا رسم الخط فارسی سے بہت کم متشابہ اور عربی سے ملتا جلتا ہے۔ متحد الصّوت یا متشابہ الصّوت حروف کی بقا سے نہ اُن زبانوں کی ترقی میں کبھی کوئی رُکاوٹ ہوئی ہے نہ اُردو میں ہو سکتی ہے۔ عربی جدید و فارسی جدید میں یورپ و ایشیا کے اکثر علوم و فنون کا اقتباس و ترجمہ ہو رہا ہے۔ دونوں زبانیں علمی بنائی جا رہی ہیں۔ اُردو زبان بھی انھیں ذرائع سے علمی زبان بن جائے گی۔ کمی حروف سے علم اللسان اُردو بالکل ناقص ہو جائے گا۔ عربی و فارسی کے بے شمار الفاظ کی تاریخ معلوم نہ ہو سکے گی۔

حروف بڑھانے کی ضرورت

اگر آپ اُردو کو علمی زبان بنانا چاہتے ہیں تو حروف بڑھانے کی ضرورت ہے وہ اس طور پر کہ بھاشا کے بہت سے حروف شامل کر لئے جائیں مثلاً پھا،

کھا، پھا، چھا، جا وغیرہ۔ اس لئے کہ اُردو میں بھاشا کا عنصر بھی بہت زیادہ ہے اور تسہیل تفہیم کے لئے یہ زیادتی نہایت مفید ہوگی۔

انگریزی میں کمی حروف

یورپ کی اور زبانوں کو دیکھ لیجئے۔ حروف کی کمی کسی زبان میں مستحسن نہیں سمجھی جاتی۔ ماہرین علم الاصوات کوشش کر رہے ہیں کہ ایجاداتِ علامات سے حروف کے شمار کو زیادہ کردیں۔ شاید آپ یہ کہیں کہ امریکہ والے الفاظ سے بعض حروف کو گرا رہے ہیں۔ مثلاً وہ valour کو valor یا though کو the لکھنے لگے ہیں۔ اس کی وجہ صرف اتنی ہے کہ وہ کمی وقت چاہتے ہیں۔ اُن کی یہ کوشش ابھی تک صرف ایک محدود حلقہ میں قابل قدر نگاہوں سے دیکھی گئی ہے۔ ورنہ خود انگلستان میں یا دنیا کے اُن دیگر حصص میں جہاں انگریزی کا راج ہے اس قسم کی کمی تحریر میں نہیں برتی جاتی۔ دوسری بات دیکھنے کی یہ ہے کہ اُن کی یہ کمی "تلفظ" پر مبنی ہے نہ کہ حروف پر۔ بات یہ ہے کہ valour یا though میں بالکل وہی "تلفظ" جو تمام حروف کی یکجائی سے حاصل ہوتا ہے وہی valor یا tho سے بھی باقی رہتا ہے۔ مگر اُردو میں آپ کو مشکل سے کوئی ایسا لفظ ملے گا جس میں کئی کئی حرف مل کر ایک لفظ میں ایک ہی آواز پیدا کرتے ہوں۔

کمی حروف سے ایہام اور شک

دوسری بات دیکھنے کی یہ ہے کہ ز/ذ/ض/ظ یا ت/ط اگر صحیح مخارج سے ادا کئے جائیں تو ان میں بہت فرق ہے اور انھیں فروق کی امداد سے مادہ

مخرج اور مشتقات الفاظ میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ لہٰذا صرف کسی ایک کے باقی رکھنے میں تحقیق مفہوم "تدقیق معنی کے تمام مدارج میں وہم و شک پیدا ہو جائے گا اور تحریر و تقریر کے صحیح مطالب سمجھنے میں بہت زیادہ دقت ہوگی۔

اُردو کا موجودہ رسم الخط

اُردو کا موجودہ رسم الخط کسی اعتبار سے مُشتبہ یا مُغلق نہیں۔ لفظوں کے معنی و مفہوم نہایت آسانی سے سیاق و سباق عبادت کی بدولت سمجھ میں آجاتے ہیں۔ پھر ناحق کی دردسری سے فائدہ؟ اب رہی یہ بات کہ بتدیوں کی سہولت کا خیال مدِ نظر ہو تو اس کے متعلق مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ موجودہ رسم الخط بتدیوں کے لئے ہرگز دشوار یا شکوک انگیز نہیں ہے۔

جدید اعراب کی ضرورت

مجھے حیرت ہے کہ مخلصین ادب اُردو نے اصلی بات کی طرف توجہ نہیں فرمائی اور وہ یہ کہ اگر آپ اُردو کو علمی زبان بنانا چاہتے ہیں تو آپ کو جدید علامات کی ضرورت یقینی طور پر ہے۔ غیر زبانوں سے اخذ و ترجمہ کرنے میں یا کسی دقیق علمی مسئلے کے بیان کرنے میں جو دقت ہوتی ہے، اس میں کمی اعراب کا حصہ بھی ضرور ہے۔

اعراب کا فائدہ

ممکن ہے کہ اب تک اُردو کو اس کی ضرورت نہ رہی ہو مگر اب کیا ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ بعض وقت محض علامات کے نہ ہونے سے جملہ کے معانی و مفاہیم کس قدر بدل جاتے ہیں۔ یہاں علامات سے میری مراد اعراب محض یعنی زبر، زیر، پیش، ٹنڈیا

جزم نہیں ہے، بلکہ ڈیش، کاما، سیمی کولن، کولن، فل پوائنٹ۔ سوالیہ استفہامیہ نقاط وادین اور قوسین ہیں۔ یورپ و ایشیا کی تمام مہذب زبانوں کا دارومدار محض انہیں علامات کی درستی و تکمیل پر ہے اور ان کے صحیح و غلط مصرف سے ایک ہی جملے کے متعدد معنی ہو جاتے ہیں۔ ایک آسان سی مثال ملاحظہ فرمائیے آپ کسی خاص کام میں مصروف ہیں۔ آپ کا نوکر آتا ہے اور کہتا ہے کہ ایک آدمی آپ سے ملنے آیا ہے۔ آپ بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں "روکو مت آنے دو" اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک تو یہ ہے کہ مت آنے دو۔ رکو دوسرے یہ کہ آنے دو روکو مت۔ آواز کے اتار چڑھاؤ سے آپ کا مافی الذہن تقریر کے وقت معین اور صاف ہو جاتا ہے۔ مگر تحریر کے وقت بے زبان صفحات کے الفاظ بے آواز ہوتے ہیں۔ لہذا پڑھنے والے کو بجا طور پر دھوکا ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر آپ اعراب سے مدد لیں اور "روکو" یا مت کے بعد کوئی نشان لگا دیں تو معنی صاف ہو جائیں گے۔

تلفظ کے فروق

اس کے علاوہ اردو کے رسم الخط میں ایک کمزوری یہ ضرور ہے کہ بھاشا کی طرح اس میں مضموم اور مکسور حروف کے فروق ظاہر کرنے کے لئے علامات نہیں ہیں مثلاً دو لفظوں کو لے لیجیے دوستی اور دوسری۔ پہلے کا تلفظ گوشتی کے وزن پر ہے اور دوسرے کا تلفظ گھومتی کے وزن پر ہے۔ یا مثلاً پیٹ اور پیٹ ایک "لیٹ" کے وزن پر ہے۔ دوسرا کیٹ کے وزن پر ہے۔ یعنی واؤ مجہول و معروف اور یائے مجہول و معروف کے امتیاز کے لئے بھی نشانات کی ضرورت ہے۔ اکثر

الفاظ ہیں حروف مضموم کا تلفظ بھی جداگانہ ہے مثلاً جُدا اور کُھلا پہلا بُھلا کے وزن پر ہے۔ دوسرا گِلا کے وزن پر ہے یا مِلا اور بِنا کو لے لیجئے دونوں کا تلفظ جُداگانہ ہے۔ اور اعضائے تلفظ یعنی زبان، تالو یا دہان وغیرہ سب کی حالتیں جداگانہ رہتی ہیں۔ میرے خیال میں سب سے سہل تدبیر یہ ہوگی کہ لانبی اور چھوٹی آوازوں کے لیے مقررہ نشانات ضمہ و کسرہ سیدھے اور اُلٹے طریقہ سے معین کر دئے جائیں۔ اس طور پر تلفظ کے متعلق کوئی شبہ یا ابہام باقی نہ رہ جائے گا۔

خط کشیدہ الفاظ

مجھے اُردو میں ایک کمی اور نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ جن الفاظ پر خاص طور سے زور دینا ہوتا ہے۔ اُن کے اوپر یا نیچے صرف خط کھینچ دیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ علمی نقطۂ نظر سے درست نہیں ہے فقرے اور جملوں پر خط کھینچا جاسکتا ہے تاکہ عبارت کا خط کشیدہ حصہ زیادہ غور سے پڑھا جائے۔ مگر مخصوص الفاظ جن پر تکلّم کے وقت آسانی سے زور دیا جاسکتا ہے اُس کے لئے غالبًا اسہل الطریق طریقہ یہ ہوگا کہ عربی طرز تحریر اختیار کی جائے۔ انگریزی میں بھی جن الفاظ پر زور دینا ہوتا ہے وہ ذرا ممتاز طور پر لکھے جاتے ہیں۔ کسی خاص لفظ یا خاص الفاظ کو تو عربی میں لکھنا نہ تو موجب طوالت ہوگا نہ موجب ابہام۔ اس کی ضرورت بہت زیادہ ہے۔ مثلاً آپ ایک جملہ کو لے لیجئے "آپ کلکتہ جائیں گے"۔ تحریر میں معنی کی مختلف صورتیں ہونگی ۱۔ آپ کلکتہ جائیں گے (بیان محض یا سوال محض) ۲۔ آپ کلکتہ جائیں گے۔ (استعجاب یا استہزاء) آپ کلکتہ جائیں گے (مسافت و بُعد کا خیال) ۴۔ آپ کلکتہ

جائیں گے (اظہار تحیر یا تیقن کا سوال) بہت سے نشانات اُردو رسم الخط میں رائج ہوتے جلتے ہیں اور میرے خیال میں ضروریات زمانہ سے تمام ضروری نشانات بھی بتدریج اُردو طرز تحریر میں منتقل و مقبول ہوتے جاتے ہیں۔

ادب کی پیدایش

تقاضائے فطرت انسانی کا نتیجہ

ادب کے پیدایش کی تحقیق بنفس خود بہت دشوار ہے۔ اور ہمارے احاطۂ موضوع سے باہر ہے مگر آمد سخن اور ترتیب کے لحاظ سے اس بارے میں بھی چند اشارات غیر مفید نہ ہوں گے۔ ادب اور خیالات میں جس قدر گہرا تعلق ہے اُس کا بیان صفحات گذشتہ میں ہو چکا ہے۔ لہذا ان کے فوائد کا اعادہ تحصیل حاصل سمجھ کر اُس سے قطع نظر کرتا ہوں۔ اور صرف یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ادب تقاضائے فطرت انسانی کا نتیجہ اور احساس ضرورت بقا کا حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کاغذ و قلم کا ذہنی وجود بھی نہ تھا اُس وقت بھی ادب پتھروں کی تہوں میں اور ہرن کی کھالوں میں یا دیگر فلزات کے پتروں میں جلوہ آرا تھا۔ قرون ماضیہ میں بعض نسبتاً متمدن اقوام کے تمام حروف تہجی تصویروں پر مشتمل تھے۔ جس کا کچھ کچھ اثر آج بھی چین اور اطراف چین کی بعض زبانوں میں باقی ہے۔ عرب میں ہرن کی مدبوغ کھال ایک زمانہ تک استعمال ہوتی رہی۔ آج سے دو ہزار برس پہلے انجیل مقدس چمڑے پر لکھی گئی تھی۔ جو کئی اونٹوں کا بوجھ تھی، جس کا کچھ حصہ کتب خانہ اسکندریہ

اور برٹش میوزیم میں اب بھی محفوظ ہے۔

بعض اکتشافات

یہ باتیں ہزارہا برس پہلے کی ہیں جن کا سراغ تحقیق و تدقیق کے فدائیوں نے منقش پتھروں، مصور کھالوں یا دوسری مدفون فلزات سے لگایا گیا ہے۔ حال میں قبر فرعون اور دوسری مصری قبریں کھودی گئی ہیں، جن میں بہت کتبے عبرانی زبانوں میں اور اکثر ایسی زبانوں میں نکلے ہیں جن کے سمجھنے والے بھی اب پردۂ دنیا پر باقی نہیں ہیں۔

زبانِ اُردو کی پیدائش

جس طرح ادب مطلق کی ابتدا کا تعین ابھی تک نہیں ہوا اسی طرح ادب اُردو کی پیدائش کا حال بھی ابھی تشنۂ بحث عنوان سے تحقیق نہیں ہوسکا۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ زبان اُردو کی ابتدا سولھویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ بعض محققین اس کے بعد کا زمانہ بتلاتے ہیں۔ بہرحال اس امر پر سب متفق ہیں کہ سولھویں صدی عیسوی کے شباب میں زبانِ اُردو کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔

ادب اُردو کی ابتدا کو ابھی ایک سو بیس برس سے زیادہ نہیں گذرے۔ اگر آپ کو ادب کے مدارج جن کا تفصیلی بیان ادب اور زبان کے زیر عنوان ہوچکا ہے یاد ہیں تو اس دعوے کی صداقت میں ذرا بھی شبہ نہ رہ جائے گا۔ ادب کے ایک خاص جز یعنی نظم اور نظم میں بھی بالخصوص تغزل کی ابتدا آج ڈھائی سو برس پہلے سے ہوچکی تھی۔ دکن میں حیدرآباد میں، اور پھر دہلی اور لکھنؤ میں ہر جگہ اس کے چرچے تھے۔ غزل، مثنوی، قصائد، مرثیہ، ظریفانہ نظمیں یہ سب ایک عرصے سے زبان اردو میں ادا ہونے لگیں تھیں۔ اور یہ بھی

اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اُردو زبان کی نشو و نما، شعرائے ادوارِ مختلفہ کی ممنونِ احسان، اور مرہونِ منت ہے۔ مگر نظم ادب کا جزوِ اعظم سہی، کُل نہیں ہے۔ اسّی برس پہلے اُردو نثر کا پتہ کہیں کہیں تو چلتا ہے مگر اتنا کم جو نہ ہونے کے برابر ہے۔ دربار اور کچہری کی زبان بھی فارسی میں تھی۔ خط و کتابت بھی فارسی میں ہوتی تھی۔

آج جتنا کچھ سرمایہ، نثر، ناول، قصص، ناٹک یا دیگر ادبیاتِ منثور میں اُردو کے پاس موجود ہے۔ اس کا بہت زیادہ کیا معنی قریب قریب کُل حصّہ اسّی برس کے اندر جمع ہوا ہے۔ آپ کو اسّی برس سے پیشتر بھی اُردو نثر کی بعض کتابیں مل جائیں گی، مگر اُن کی مجموعہ تعداد دس پندرہ برس سے زائد نہ ہو گی۔

ارتقار کے مختلف مدارج

اُردو زبان موجودہ حالت تک پہنچنے کے لئے اپنی ارتقار کے مختلف مدارج طے کر چکی ہے۔

پہلا درجہ یا دَور

۱۔ سب سے پہلا درجہ یا پہلا دَور وہ تھا، جب فاتحین کی زبان پر عربی، پہلوی، دری اور افغانی زبان کے الفاظ چڑھے ہوئے تھے۔

تحریر کا انعدام

مفتوحین، پراکرت، دکھنی بھاشا، تلنگی اور مرہٹی سے آشنا تھے۔ اس وقت اُردو میں صرف گفتگو ہوا کرتی تھی۔ تحریر کا کوئی ذکر نہ تھا۔

دوسرا دَور

۲۔ دوسرا وہ تھا جب سہولتِ تفہیم اور آشنائی گفتگو کی بدولت

الفاظ نے بتدریج مختلف شکلیں اختیار کرنی شروع کیں۔ آج بھی اگر آپ اکثر مروج الفاظ کی ابتدا دارتقا کی تحقیق فرمائیں گے تو معلوم ہوگا کہ تلفظ و معنی میں بتدریج فرق ہوتا رہا ہے۔

تیسرا درجہ یا دَور تیسرا دَور وہ تھا جب وَلی، میر، سودا اور درد نے ریختہ میں شاعری شروع کی، اُردو کی اصلی بُنیاد اُسی وقت سے پڑی۔ ان لوگوں نے ہماری زبان پر وہ احسان کیا ہے جس کا شکریہ ادا ہی نہیں کیا جا سکتا۔ زبان کو عامیانہ، سوقیانہ اور مغلق الفاظ و خیالات سے صاف کیا ہے۔ آنے والی نسلوں کے لئے ایک شاہراہ کھول دی ہے۔ ہزاروں استعارات و تشبیہات سیکڑوں صوری اور معنوی صفات سے اُردو کا دامن مالا مال کر دیا ہے۔

چوتھا دَور ۴۔ چوتھا دَور وہ ہے جب ایک طرف اُردو کی ٹکسال دہلی اور لکھنؤ میں قائم تھی۔ دوسری طرف تجارت پیشہ انگریز یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی محنت و صرف رقم کی مدد سے اُردو زبان کے باقاعدہ قواعد و اصول مرتب کر رہی تھی۔ اور بعض شعراء نے تذکرے یا قصص کی طرف توجہ کی تھی۔ ایسٹ انڈیا والوں نے مصالح سیاسی اور حق پسندی پر نگاہ کر کے اس غریب زبان کا نام اُردو نہیں رکھا۔ ہندوستانی رکھا۔ کاش ملک و قوم کے فدائی اس نکتہ پر ٹھنڈے دل سے غور کریں تو آج بھی اُردو، ہندی میں جو بے بات کی بات جنگ ہو رہی ہے اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہ جائے۔

پانچواں دَور ۵۔ پانچواں دَور وہ تھا، جب ہندوستان نے شاعروں میں غالب، و مومن، و آتش، ناسخ، انیس و دبیر، داغ و امیر

اور اُو بار میں آزاد و حالی، شبلی و سرسید پیدا کئے جنھوں نے نئی نئی راہیں نکالیں۔ اور کامیابی کے ساتھ اُن راہوں پر گامزن رہے۔

چھٹا دور | ۶۔ چھٹا دَور موجودہ دَور ہے، جس سے ہم آپ کافی طور پر واقف ہیں۔ یہ دَور دارالمصنفین انجمن ترقی اُردو، اکبر، اقبال، نشاد، چکبست کی شاعری اور دوسری علمی کوششوں کی ابتدا سے شروع ہوتا ہے۔ علوم و فنون، فلسفہ و حکمت پر آئے دن کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ لوگوں میں تحقیق و تدقیق کا شوق پیدا ہو چلا ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ میرے موضوع نے اس وقت اجازت نہ دی کہ میں دل کھول کر ہر دور کے متعلق لکھتا، اگر واقعات و اوقات نے مساعدت کی تو ایک مفصل اور مبسوط مضمون "ارتقائے اُردو" کے عنوان سے لکھنے کا ارادہ ہے جس میں حتی الامکان ہر دَور کے محسنین کا ذکر شرح و بسط کے ساتھ کیا جائے گا۔

عناصر ادب و ادیب

ادب و ادیب کے وہ خاص عناصر جن کی بدولت ادب مطلق حقیقی معنوں میں ادب کہلانے کا مستحق ہے پانچ ہیں۔ اور ہر عنصر کی کئی اجزا میں تحلیل کیا جا سکتا ہے۔ پہلا عنصر:-

۱۔ ذہن، فہم، فکر، ذکا، حس و تمیز کا مجموعہ ہے۔

مطالعہ و مشاہدہ | ادیب اس مجموعہ کی مدد سے مطالعہ و مشاہدہ کی بدولت

صحیح اثرات سے متاثر ہوتا ہے۔ صحیح تجربہ و تجزیہ و استقرار و تخرجہ کی منازل طے کر کے اُن اثرات کو صحیح طور پر ادا کرتا ہے۔

تاثرات کا راز | اس سے پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ ادب کی دلچسپی عالمگیر ہوتی ہے۔ اس موقع پر بھی یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ادب کا اثر انسان کے تمام قوائے باطنی، عقل و ادراک، شعور، حسیات، جذبات، دل، دماغ سب پر مجموعی طور سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی حیثیت سے ادبی پیرایہ میں جو مضمون پیش کیا جاتا ہے اُس کی تاثیر خاطر خواہ ہوتی ہے۔

درجہ اثرات مختلف ہیں | مذکرہ بالا عنصر کے اکثر اجزا متحدہ و متفقہ طور پر سرگرم کار رہتے ہیں۔ اور بعض اوقات مختلف شکلوں میں معین ہوتے ہیں۔ یعنی بعض پہلے متاثر ہوتے ہیں بعض بعد کو یا بعض کم متاثر ہوتے ہیں۔ بعض زیادہ۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ادیب دوسرے ادیب سے ممتاز ہے۔ اور ایک ہی ادیب کی مختلف ادبی تصنیفات بہ حیثیت ادب ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس اختلاف کی نشان ہر جملہ میں پائی جاتی ہے۔ استقرار و تخرجہ کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ ادیب کا سطح نظر وسیع ہو جائے اور نتائج صحیح طور پر نکل سکیں۔

جذبات وغیرہ۔ | ۲۔ ادب جذبات، محسوسات، تاثیرات، مدرکات و میزات کا گلدستہ ہے۔

تیسرا عنصر ان اجزا پر مشتمل ہے جو موضوع کلام بہ نفس خود مصنف کے دل میں پیدا کرتا ہے۔

تخیل و تصور وغیرہ | ۳۔ تخیل و تصور کی دولت ہے، جن کے بغیر ادیب و ادب دونوں سطحی رہ جاتے ہیں۔

تجربہ و علم وغیرہ | ۴۔ تجربہ و علم صاف ظاہر ہے۔ معلومات و تجربات نہ ہوں تو غریب ادیب کیا کرسکتا ہے۔

حسن نظم وغیرہ | ۵۔ حسن نظم۔ اثر آفرینی، نازک خیالی، زور بیان، قوت ادا، امتیازِ اصوات، ذوقِ موسیقی، طرز ادا اور انتخابِ خیالات ہے۔

خاص طور پر آخر الذکر عنصر کے اجزا قابلِ ذکر ہیں جو سچے ادیب کو تک بند شعرا اور تنگ نظر نثار سے ممتاز کرتے ہیں۔

اُردو کو ایسے ادیب کم و بیش ہر دور میں ملے ہیں۔ جن میں یہ تمام عناصر قابلِ رشک طور پر کسی نہ کسی مناسبت سے، اور کسی نہ کسی درجہ میں موجود رہے ہیں۔

آزاد اور انیس | مثال کے طور پر آزاد اور انیس کو لے لیجئے۔ اُن کی کوئی تصنیف اور ان کا کوئی مرثیہ اُٹھا لیجئے۔ ایک ایک سطر اور ایک ایک فقرہ میں یہ تمام عناصر موجود ہیں۔ حسن نظم کی یہ حالت ہے جس طرح جوہری سنگ و رنگ۔ قدو وزن کے اعتبار سے چھوٹے بڑے موتیوں کی سجل لڑیاں تیار کرتا ہے۔ اسی طرح آزاد و انیس کو ترتیب خیالات اور نشست الفاظ میں ید طولیٰ حاصل ہے۔

خشک سے خشک اور پیچیدہ سے پیچیدہ مضامین اس صفائی اور سادگی

سے بیان ہو جاتے ہیں کہ ہر لفظ میں جادو اور ہر حرف میں موہنی پیدا ہو جاتی ہے۔ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اور ہر بار پڑھنے میں ایک نیا لطف آتا ہے۔

ادب و ادیب کا گہرا تعلق

اب ذرا ادب اور ادیب میں جو گہرا تعلق ہے اسے ملاحظہ فرمائیے۔ ادب حیات مصنف کا دوسرا نام ہے یعنی جس طرح ماہرین علم الاغذیہ کسی کیڑے مکوڑے کی غذا معلوم کر لینے کے بعد اس کے تمام عادات و خصائل کا پتہ لگا لیتے ہیں۔ اسی طور پر ماہرین ادب کسی ایک فقرہ یا مصرعہ کی مدد سے نثار یا شاعر کے تمام عادات و خصائل کی چھان بین کر لیتے ہیں۔ اس لئے کہ ادیب ایک باکمال مصور یا ایک ماہر آئینہ ساز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُس کی تصنیفات صرف خیالات و محسوسات کی تصویریں نہیں ہوتیں بلکہ ایک ایک فقرہ آئینہ روشن بن کر ذاتی تجربات، وقّت مطالعہ، ذہانت طرز ادا، عادات، خصائل افتادِ طبیعت، ماحول، جدت، غرض کہ تمام باطنی اور ظاہری خوبیوں کو نمایاں کر دیتا ہے۔

خالص ادب

میں نے اس جگہ قصداً کمزوریوں کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس کے دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ ادیب کی کمزوریاں صرف ادب کی کمزوریوں سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ اور ایسا ادب جس میں کمزوریاں ہوں ہمارے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ دوسرے یہ کہ تصنیف کیا ہے؟ مصنف کی تمام قوائے ظاہر و باطن کا لُب لُباب یا دوسرے لفظوں میں مصنف کی روح کا عطر ہے، پھر آپ ہی بتائیے، مصفا و مقطر

گلاب میں کسی طرح کی کوئی بدبو، یا ناسازگار کیفیت باقی رہ سکتی ہے؟

حیات کی ظاہری لغزشیں

یہ بھی صحیح ہے کہ ادیب کو "ادب مجسّم" ہو جانا چاہیے۔ اور یہ بھی درست ہے کہ ادب، حیاتِ ادیب کا پاکیزہ ترین جوہر ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ہی ساتھ یہ نکتہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ادیب کے سامنے یا مصنّف اپنی تصنیف کے مقابلہ میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو خالق و مخلوق میں ہے۔ غالبًا بعض حضرات کو میرے اس بیان پر غصہ آئے گا اور وہ اپنے نزدیک میری تردید میں چند ایسے اُدبا کا ذکر کریں گے جن کی تصانیف نہایت پاکیزہ ہیں۔ مگر جن کی حیات لغزشوں سے بھری ہوئی ہے۔ خوش قسمتی سے ادبارِ اُردو میں مجھے اب تک کوئی ایسی مثال نہیں مل سکی، مگر معترضین کی چار چار آنکھیں ہوتی ہیں۔ وہ کہے گا کہ انگلستان کے زبردست شاعر شیلی کو لے لیجیے، غریب بیوی کو چھوڑ دیا۔ دوسری عورت کرلی، یہاں تک کہ پہلی بیوی کو خودکشی کرنی پڑی وغیرہ وغیرہ۔

میں ایسے حضرات سے صرف چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

شیلی کے بعض سوانح

۱۔ آپ کو یا تو اصلی واقعات معلوم نہیں ہیں یا آپ اُن کی رنگ آمیزی فرماتے ہیں۔ چھوڑ دینے کی پہل، شیلی نے نہیں بلکہ اُن کی پہلی بیوی نے کی تھی۔

۲۔ شیلی، زندہ دل شیلی، پاکیزہ نفس شیلی کا یہ فعل کسی نفرت پر مبنی نہ تھا، اس لئے کہ اُس نے اپنی بیوی کے ساتھ رہنے کے لئے پہلی کو دعوت

دی تھی اور وہ کچھ دنوں وہاں مقیم بھی رہیں۔

۳۔ شبلی کا یہ فعل کسی نفس پرستی پر منحصر نہ تھا بلکہ

الف۔ اُس کے نزدیک ازدواج کا حاصل یہ تھا کہ میاں بیوی میں روحانی علائق اور عشق کی پینگیں روز بروز بڑھتی جائیں۔ یہ بات پہلی بیوی کے ساتھ کسی وجہ سے بھی حاصل نہیں ہو سکی۔

حقیقت

ب۔ خود شبلی کی زندگی کے اور بہت سے واقعات ایسے ہیں جن سے نفاستِ طبع اور علوئے نفس کا پتہ چلتا ہے۔ اُن واقعات کو بھی اِن واقعات کے ساتھ اصلاحی ترازو میں رکھ کر دیکھیے تو پتہ چل جائے گا کہ کون سا پلہ بھاری ہے۔

شبلی نے جو کچھ کیا اپنی افتادِ طبیعت اور تقاضائے فطرت کے موافق کیا۔

اگر اب بھی آپ کی تشفی نہ ہو سکے تو اس کے سوا کیا عرض کر سکتا ہوں کہ آپ جو کچھ فرمائیے بجا ہے۔

شانِ مطالعہ

سرسری مطالعہ کے وجوہ

ہم لوگ بلند پایہ ادیب اور بلاغت پسند شعراء کے کلام کا مطالعہ نہایت سرسری طور پر کرتے ہیں جنکے چند وجوہ خاص ہیں۔

آب و ہوا کا اثر

۱۔ ہندوستان کی آب و ہوا مقام و فضا کے اعتبار سے

مختلف الکیفیت ہے۔ ہم تن آسانی اور سہولت پسندی کی فضا میں سانس لیتے رہتے ہیں۔ ہم میں صبر آزما محنت و استقلال کے جوہر اُسی قدر موجود ہیں۔ جتنے دنیا کی اور کسی مہذب و متمدن قوم میں ہو سکتے ہیں۔ مگر حالت یہ ہے کہ بہت کم کتابیں پڑھتے ہیں۔ اور پڑھتے بھی ہیں تو اس طرح سے کہ محض تفریح یا وقت گزاری مدنظر ہوتی ہے۔ کتاب پڑھی اور گوشہ میں ڈال دی۔ یہ نہیں سمجھتے کہ مصنف کے خیالات، الفاظ کی سیپیوں میں، بحرِ عبارت کی تہ پر۔ انمول موتیوں کی آب و تاب کے ساتھ جمع ہیں، جبتک ہم ماہر غوطہ خور کی طرح، دنیا کے اور علائق سے خالی الذہن ہوکر اور اپنی جان پر کھیل کر تہ تک نہ پہونچیں گے، موتیوں کا تو ذکر ہی نہیں سیپیوں کی ماہیت سے بھی بے خبر رہیں گے۔ ہم کو ضرورت اس بات کی ہے کہ غالب یا آزاد، میر، یا سرسید، شبلی، یا انیس، حالی یا اکبر کے کلام و تصانیف کے مطالعہ کے وقت پوری مستعدی اور جوانمردی کے ساتھ مصروف ہوجائیں۔ اور بار بار پڑھیں۔ اس واسطے کہ بلند پایہ حضرات کا کلام بھی بلند پایہ ہوتا ہے۔ اور جبتک ہم اپنے آپ کو اس بلندی پر نہ پہنچائیں گے۔ وہ ہماری پستی تک اتر کر نہ آئیں گے۔

بعض لوگ کتاب کے چند اوراق محض اس نظر سے اُلٹ پلٹ لیتے ہیں کہ اس کے متعلق نہ جاننے والوں کے سامنے گفتگو کرکے اپنا رُعب بٹھائیں جو ایک طرح کی ذہنی خودکشی بھی ہے اور فریب دہی بھی ہے۔

دھوکا ۲۔ اکثر ہندوستانی اصحاب اُردو کو مادری زبان سمجھ کر اس دھوکے میں

پڑ جاتے ہیں کہ ہم کو اس پر کامل عبور ہے۔ یہ تو ہمارے گھر کی زبان ہے۔ اُن میں سے بعض حضرات کو اکثر کسی ایک لفظ کے مختلف معانی و مفاہیم، تاریخی تغیّر و ارتقار کے امتیاز سے قطع نظر، خود اس لفظ کی حقیقت و ماہیت سے بھی اطلاع نہیں ہوتی۔ اور ہم جس وقت تک یہ نہ سمجھ سکیں کہ فلاں لفظ کس زبان سے کب اور کس لئے اُردو زبان میں آیا۔ اس کی حالتیں مختلف درجات و اوقات میں کیا رہیں؟ زمانہ کے انقلاب نے اس پر کیا کیا اثر کیے؟ اُس کے تلفظ، موسیقی اور وسعت پر، رواج گفتگو، اور دیگر علمی و مدنی تحریکات نے کس کس انداز سے تاثیر کی؟ اس وقت تک ہمیں بھول کر بھی یہ خیال نہ آنا چاہیے کہ ہماری واقفیت اس طوطے سے زیادہ وقعت رکھتی ہے، جو "بنی جی بیٹھو" یا "رام رام" رٹ لیتا ہے۔

مُہلک غلطیاں

اس طور کے مطالعہ کا بدیہی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قریب المعنیٰ الفاظ کے انتخاب و استعمال میں مضرت رساں اور مہلک غلطیاں ہو جاتی ہیں اور کسی قسم کی کوئی ظاہری یا معنوی خوبی باقی نہیں رہجاتی نہ طرزِ ادا میں شگفتگی باقی رہتی ہے۔ نہ کوئی لفظ صحیح مصرف میں آسکتا ہے۔ اسی طور پر جب تک ہم الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، روزمرہ اور محاورات کے صحیح مقام سے واقف نہیں ہوتے۔ مصنف کا مطالعہ کامل طور پہ نہیں کر سکتے تو صرف یہی نہیں کہ غلط مطالعہ سے خود اپنے دل و دماغ میں متعدی و مضر جراثیم پیدا کر لیتے ہیں بلکہ جن دماغوں تک ہماری رسائی ممکن ہوتی ہے۔ اُن کو بھی انھیں امراض میں مبتلا کرتے جاتے ہیں اور اس کا سلسلہ ہزارہا سال تک قائم رہتا ہے۔

سطحی مقاصد

۳۔ اُردو ادب کو ابھی تک ایسے لوگ بہت کم ملے ہیں جو اس کا مطالعہ ادب وزبان کی حیثیت سے کرتے۔ عام حضرات اپنی شہرت یا ناموری کی غرض سے پڑھتے ہیں۔ طلبار کا طبقہ خاص طور پر اُردو کا مضمون اس لئے پسند کرتا ہے کہ نصاب تعلیم میں آسانی ہوجاتی ہے۔ کامیابی میں سہولت ہوتی ہے اور دو چار کوڑی کا روزگار مل جاتا ہے۔ اِن خود غرضیوں کے اثرات سے مطالعہ میں جو کمزوریاں پیدا ہوجاتی ہیں اُن کی تشریح کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

پتہ اُس وقت چلتا ہے جب تعلیمی زمانہ ختم کرکے مجلس و محفل میں شریک ہوتے ہیں اس وقت اسناد کی فراوانی اور معلومات کی تہیدستی سے جو سوہان روح ہوتا ہے اس کا اندازہ مشکل سے کیا جاسکتا ہے۔

مدارج کا امتیاز

۴۔ ہم لوگ اس بات کا امتیاز نہیں کرتے کہ بازاری ناول، اشتہاری رسائل، اور تجارتی اخبارمیں اور زبردست مصنفین کی کتابوں میں کیا فرق ہے۔ اُردو کا ذخیرہ اب کافی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اردو میں بھی ہر قسم کی کتابیں موجود ہیں۔ اچھی بھی، بری بھی بُری کتابوں کا تو ذکر بھی بُرا ہے مگر اچھی کتابوں میں بھی مدارج ہیں۔ بعض غیر مضر ہیں مگر مفید نہیں۔ بعض مفید ہیں، مگر کم۔ بعض بہت زیادہ مفید ہیں مگر بعض ایسی ہیں جو ہمیشہ کے لئے مفید ہیں اور بڑے دماغ سوزی کے ساتھ لکھی جاتی ہیں۔ اب شرط انصاف یہی ہے کہ جو کتاب جس لائق ہو اُسی محنت و صرف وقت کے تناسب سے اُس کا مطالعہ بھی کیا جائے۔ لطف یہ

ہے کہ اگر آپ سب سے اچھی کتاب کے بدلے کوئی دوسری کتاب پڑھتے ہیں، تو نہ صرف وقت کو ضائع کرتے ہیں بلکہ اچھی کتاب پر بھی ظلم کرتے ہیں۔

سطحی مفاہیم

۵- ہم محض الفاظ کے سطحی مفہوم سمجھ لینے سے بالکل مطمئن ہوجاتے ہیں اور معنوی خوبیوں پر بہت کم توجہ کرتے ہیں۔ ہماری آنکھیں شیشہ کی مصنوعی آنکھوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں، جن میں چیزوں کا عکس پڑتا ہے اور سچی آنکھیں رکھنے والوں کو اصلی آنکھوں کا دھوکا بھی ہوتا ہے۔ مگر خود ہم کو ان آنکھوں سے وقتی نمائش کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہماری نابینائی اسی طرح قائم رہتی ہے۔ اس تمثیل میں ایک لطیف پہلو اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ جیسے ہی لوگوں کو مصنوعی آنکھوں کی حقیقت معلوم ہوجاتی ہے، فوراً عظمت و وقار کی جگہ حیرت و مسرت سے بدل جاتی ہے۔ حسرت و مسرت کیسی؟ صانع کی صنعت و ترکیب پر آپ کی ملک و عزت پر نہیں۔ ان مصنوعی آنکھوں سے اس قدر ضرور ہوتا ہے کہ ہم کسی نہ کسی طرح سطور کتاب میں جو کچھ روشنائی سے لکھا ہوا ہے، صرف اسکو پڑھ لیتے ہیں۔ مگر وہ لطیف تحریر جو بین السطور میں نورانی حرفوں میں درج ہوتی ہے اور جو صرف محنت و علم کی خوردبین سے نظر آتی ہے، ہم کو مطلق نہیں دکھائی دیتی۔

معیار

۶- اکثر اوقات جب ہم کسی مصنف کو اپنی پسند یا معیار سے مختلف پاتے ہیں تو اس کی طرف قطعاً مائل نہیں ہوتے۔ اور اس بات کے سمجھنے کی مطلق کوشش نہیں کرتے کہ کس کی پسند اور کس کا معیار

اصح و ارفع ہے۔

نئی کتاب کا خبط

۷۔ آج کل ایک مرض اور عام ہو رہا ہے۔ وہ یہ کہ نئی سے نئی کتاب ہونی چاہیئے تاکہ اگر دس کے بعد تو سو سے پہلے اس کے متعلق گفتگو کر سکیں۔ کیا آپ نے کسی زمانہ کی تمام قابل دید کتابیں پڑھ لی ہیں؟ اگر ایسا ہے تو آپ کی یہ خواہش درست ہے۔ ورنہ ہزارہا برس پہلے کی لکھی ہوئی کتاب بھی جس کو آپ نے کبھی نہیں پڑھا، آپ کے لئے نئی ہے۔ اگر آپ یہ کہیں کہ اب سے پہلے اس کو ہزارہا آدمی پڑھ چکے ہیں، تو یہ بتائیے کہ اُن ہزارہا آدمیوں کے مطالعہ سے آپ کی لذتِ جدید میں کیا فرق پڑ سکتا ہے؟

شرائطِ مطالعہ

شرائط و فرائض مطالعہ

یہاں تک تو اُن وجوہ کا ذکر تھا، جو عموماً ہمارے لئے مانع مطالعہ ہوتے ہیں۔ اب چند منتخب شرائط کا ذکر بھی ناگزیر ہے، جن کے بغیر فرائض سے سبکدوشی نہیں ہو سکتی۔

ایمانداری اور خلوص

ہم کو نہایت ایمانداری اور خلوص سے زبردست مصنّفین کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنا چاہیئے اور اپنی ہر امکانی کوشش اس بارے میں صرف کر دینی چاہیئے کہ ان خیالات سے خوشہ چینی کر سکیں۔ یعنی جس وقت ہم کسی پاکیزہ تصنیف مطالعہ کریں تو اپنے تمام جذبات خویش اعتقادی و تعصب سے ہم کو دست بردار ہونا چاہیئے

اور صدق و محبت سے مصنف کے اصل معانی و مفاہیم کی تلاش کرنی چاہیئے۔
نہ یہ کہ ہم اپنی رائے اور اپنے خیالات کو مصنف کی تحریر میں تلاش کریں۔
اس واسطے کہ ہمارے نزدیک جو چیز بہ بت ہے۔ وہ اُس کی نگاہ میں رائی
سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ ہمیں ولی۔ تقی، سودا، آزاد، سید، انیس کے عالی
جذبات اور بلند محسوسات سے مستفید ہونا چاہیئے۔ نہ یہ کہ اُن کو اپنے سے کم نظر
سمجھ کر جس جگہ اُن کی رائے ہم سے مخالف ہو اس کا احترام نہ کریں حقیقت
تو یہ ہے کہ جب تک ہم خود اس بلند درجے تک نہ پہنچ جائیں جہاں وہ ہیں،
اُس وقت تک ہم کو ذاتی رائے قائم کرنے کا کوئی حق ہی حاصل نہیں ہے۔

ذاتی رائے

مثال کے طور پر انیس کو لے لیجیئے اگر اُن کی اور آپ کی رائے
میں کوئی فرق ہوگا تو اُس کی صرف تین صورتیں ہیں۔

۱ الف۔ یا تو انیس کی رائے آپ سے کم حیثیت ہے۔ اس صورت میں
انیس کے کلام کا مطالعہ آپ کے لیئے صرف بیکار ہی نہیں تضییع اوقات بھی ہے۔
ب۔ انیس کی رائے آپ کی رائے کے ہم پلہ ہے۔ اس صورت میں اُنکے
کلام کا مطالعہ تحصیل حاصل ہے۔
ج۔ انیس کی رائے آپ کی رائے سے کہیں زیادہ بلند، وسیع اور
سنجیدہ ہے۔ صرف اس صورت میں موصوف کے کلام کا مطالعہ آپ کے لیئے
مفید ہو سکتا ہے۔

استفادہ کا معیار

مختصر یہ کہ مطالعہ سے مستفید و مسرور ہونے کا معیار
یہ ہونا چاہیئے کہ خوب ہم کیا سمجھتے تھے اور واقعی کیا بات

پیدا ہوگئی ہے، ہمارے دنیائے خیالات و افعال کی کایا پلٹ ہوگئی ہے۔ یہی امر حاصل مطالعہ ہونا چاہیئے نہ یہ کہ "واہ جو کچھ ہم سمجھتے تھے وہی نکلا، انہیں کے منہ میں گویا میری زبان تھی۔ میں بھی تو یہی کہتا تھا۔" یہ معیار نہایت درجہ مضر و مضعف ہے۔ ممکن ہے کہ بعض خیالات میں تقاضائے فطرت انسانی اور عالمگیر قوانین طبائع کی بناپر اتحاد و اتفاق ہوجائے مگر جو جتنا زبردست مصنف ہوگا اُس کے خیالات اُسی حدتک پاکیزہ تر، بلند تر، اچھوتے اور انوکھے ہونگے۔

محنت و جانفشانی

۲۔ ہم کسی زبردست مصنف کے تمام و کمال معانی و مفاہیم کو پہلے ہی سیر میں قابو نہیں کرسکتے۔ مصنف کی نظر اس قدر وسیع ہوتی ہے کہ بعض وقت وہ خود بھی اپنی غیر محدود وسعت کا اندازہ نہیں کرسکتا۔ مگر مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے اور کسی کی محنت کبھی رائگاں نہیں ہوتی۔ رفتہ رفتہ تمام گتھیاں سلجھ جاتی ہیں اور تمام پیچیدگیاں رفع ہوجاتی ہیں۔ میں نے کلام اکبر، مراثی انیس، فلسفۂ جذبات، میر تقی کے دواوین یا اسی قسم کی اور کتابوں کا مطالعہ کئی کئی بار کیا ہے۔ اور اقرار کرتا ہوں کہ ہر بار کچھ ایسے نئے لطف حاصل ہوئے جو اس سے پہلے کبھی میرے خواب و خیال میں نہ تھے۔

مصنفین کی شان

زبردست مصنفین غنی و منعم بھی ہوتے ہیں۔ رحیم و دل سوز بھی ہوتے ہیں۔ اُن کے در سے کوئی محروم نہیں پھرتا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اُن کے بارگاہ میں انصاف و عدل کے چوکی پہرے ہر جگہ بیٹھے ہوئے ہیں اور ہر شخص کو اتنا ہی عطا ہوتا ہے جتنے کا وہ مستحق ہے۔ وہاں

نہ تو ذات پات کی پوچھ گچھ ہوتی ہے نہ رشوت و رسوم سے کام چلتا ہے، بس جو کچھ ہے قوت بازو سے حاصل ہوتا ہے۔

بغیر محنت کے کچھ حاصل نہیں ہوتا

کیا اچھا ہوتا اگر بھارت ماتا تمام دھاتوں کو اور بالخصوص سونے، چاندی کی تمام مقدار جو ہندوستان کی تمام کانوں میں موجود ہے۔ اکٹھا کر کے ہمالیہ پہاڑ یا بندھیاچل کی پہاڑی پر سب سے اونچی والی چوٹی پر لا کر جمع کر دیتی اور جو شخص جتنا چاہتا بلا تکلف وہاں سے لاتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ کان کنوں کی طرح تمام آلات سے سج کر آستینوں کو کہنی تک الٹ کر، سخت پتھروں اور زمین کی تاریک گہرائیوں کی تہوں کو توڑ توڑ کر خام سونا نکالا جاتا ہے۔ پھر ہزارہا ترکیبوں کے بعد، پگھلا کر، صاف کر کے اور اجزا کو جدا کر کے خالص چاندی یا سونا حاصل کیا جاتا ہے۔ یہی حالت بعینہٖ زبردست مصنفین کے خزانوں کی بھی ہے جہاں کوئی روک ٹوک نہیں۔ کوئی قید و شرط نہیں، صرف یہ کہ محنت کرو اور انعام پاؤ۔ اسی واسطے جس وقت مطالعہ کتب منظور ہو اس وقت صحت کی درستی، دماغ کی یکسوئی اور فرصت کا سکون ضروری ہیں۔

علم اللسان کی ضرورت

۳- اُردو میں بھی اور زبانوں کی طرح الفاظ مختلف زبانوں سے لیے گئے ہیں۔ انگریزی، پرتگالی، دکھنی، مراہٹی، سنسکرت، فارسی، عربی، ترکی، پراکرت، بھاشا و دیگر مقامی زبانوں کے لفظ اس میں موجود ہیں۔ بعض اپنی اصلی حالت پر قائم ہیں۔ بعضوں میں صوری یا معنوی تبدیلیاں اتنی زیادہ ہو گئی ہیں کہ اب اصل زبانوں میں اُن کا پہچاننا بھی

دشوار ہو گیا ہے۔ ہم کو چاہیے کہ مشتبہ الفاظ کی پوری پوری تحقیق کریں۔ یعنی اصل زبان میں اس کے کتنے معانی تھے؟ اردو میں کب، کیسے، کیوں اور کتنے ذرائع سے منتقل ہوا؟ براہ راست آیا یا اور زبانوں کے منازل طے کرتا ہوا آیا۔ مختلف درجات میں کیا کیا تبدیلیاں ہوتی رہیں اور کب کب کن کن معنوں میں استعمال ہوتا رہا؟

افسوس کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اس قسم کی تحقیق کا مواد ادب اُردو میں حوصلہ شکن نہیں تو ہمت افزا بھی نہیں ہے۔ بہرکیف تحقیق الفاظ و محاورات و روزمرہ ضرب الامثال کے لئے فرہنگ آصفیہ، شیکسپیر، اسٹینگاس دیگر مختلف رسائل ،گنجینہ، سرمایہ، تحقیق وغیرہ بہت سی چیزیں موجود ہیں۔ حال میں پنجاب سے سرگذشت الفاظ پر ایک رسالہ نکلا ہے جو نقش اول ہونے کے اعتبار سے جامع و مانع تو نہیں ہے مگر جدید و مفید ہونے کے اعتبار سے قابل قدر و لائق تقلید نمونہ ہے۔ سُنا ہے کہ اُردو کی انسائیکلوپیڈیا بھی کسی صاحب نے مرتب کی ہے۔ وہ دن دور نہیں جب اُردو کا دامن علم اللسان و کلام کے موتیوں سے بھر جائے گا۔ کچھ بھی ہو اس قسم کی پہلی کوشش کرنے والوں کے سر اولیت کا سہرا ہمیشہ رہے گا اور جو دَور بھی آئے اُن کی محنتیں عزت و قبولیت کی نگاہوں سے دیکھی جائیں گی۔

ہمدردی ۴۔ زبردست مصنفین کے واردات قلب میں ہم کو کمال ہمدردی و دلسوزی سے شریک ہونا چاہیے۔ ورنہ ہم آزاد یا انیس کے دوران مطالعہ میں اکثر اوقات اُن کے محسوسات و مدرکات کا اندازہ ہی

نہیں کر سکتے۔ واقعہ یوں ہے کہ محبت سے دلچسپی بڑھ جاتی ہے اور مطالعہ کے لیے دلچسپی ناگزیر ہے۔

مطالعہ مصنّف، سیر، تذکرہ، حیات

ضرورت ادب و ادیب میں جو گہرا تعلق ہے اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ لہٰذا صریحی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مطالعہ تصنیف کے ساتھ مصنّف کا مطالعہ بھی ضروری ہے ورنہ تصویر کا صرف ایک ہی رُخ نظر آئیگا۔

طریقے کامیاب مطالعہ مصنّف کے بہت سے طریقے عقلا و ناقدین داد دہ بالے نکلے ہیں جن میں بہترین دو ہیں۔

ترتیب تصانیف ا۔ ترتیب تصانیف کی مدد سے مطالعہ کرنا۔ یعنی جس نظم کے ساتھ مصنّف نے یکے بعد دیگرے اپنے دل و جگر کے ٹکڑے رشتہائے تحریر میں پروئے ہیں۔ اُن کا باقاعدہ مطالعہ بھی اُسی ترتیب کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ تاکہ تجربات و معلومات، ذہانت و احساس کے ارتقار ذہنی کے مدارج سمجھ میں آتے جائیں۔ افسوس ہے کہ اُردو میں ابھی تک لوگوں نے اس طرف توجہ نہیں کی مگر رفتار زمانہ سے اُمید ہے کہ بہت جلد یہ طریق مطالعہ رائج ہو جائے گا۔ مثال کے طور پر میر تقی میر کو لیجیئے۔ قریب ہر شخص اُن کی کلّیات سے واقف ہے اور حال ہی میں اُن کا فارسی کا لکھا ہوا تذکرہ شعرار کا بھی پتہ لگایا گیا ہے۔ مگر کلّیات کی ترتیب میں غزلیں ردیف وار درج ہیں۔ اُسکے بعد نظمیں

قطعات، مثنویات، مرثیہ جات، رباعیات سب کچھ شامل ہیں۔ کلیات کی ترتیب و تقسیم اصنافِ سخن کے لحاظ سے کی گئی ہے، زمانۂ حیات کی ترتیب کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ میر کا پورا کلیات ایک شان کا نہیں ہے، تدوین و تکوین مروّجہ و متداولہ کی بنا پر سارا کلام تو گلدستہ ہو گیا ہے، مگر اس میں ہر قسم کے پھول، ہر رنگ کی کلیاں اور ہر خوشبو کی پنکھڑیاں شامل ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ صاحبانِ نظر اور نکتہ سنج پھولوں کو نہ صرف کانٹوں سے چن لیں بلکہ اُن کی ترتیب ایسے ادوار میں کریں کہ طفل میر کو نوجوان میر اور نوجوان میر کو معمر میر صاحب سے ممتاز کر سکیں

حیات کے مدارج کا اثر تصنیف و کلام پر

کوئی شاعر ہو، کوئی ادیب ہو اُس کا کلام ہر سن و سال میں یکساں نہیں ہوتا، امتدادِ زمانہ حوادثِ حیات اور انکشافاتِ روزگار کے اثرات ہر زمانہ کے کلام میں جداگانہ اور نمایاں حیثیت سے جلوہ فروز رہتے ہیں۔ بچپن کے کلام میں عموماً خامی اور نومشقی کی جھلک ہوتی ہے۔ جوانی میں زورِ بیان اور قوتِ ادا کے جوہر پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور بڑھاپے میں قدرت و پختگی کی شان آجاتی ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی، مدنی، ملی اور معاشرتی واقعات بھی کلام پر اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے اور سچ کہا جاتا ہے کہ میر صاحب کے کلام میں درد بہت پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا اثر عالمگیر اور باقی رہنے والا ہے۔ انگلستان کے ایک زبردست شاعر کا نظریہ ہے کہ انسان کلام کی دھی

شیرینی بہترین ہوگی جو نہایت غم خیز جذبات کی حامل ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیجئے کہ فطرت انسانی اور تقاضائے بشری یہی ہے کہ غم انگیز اور درد آمیز خیالات کا اثر بہت زیادہ ہے۔ اس کی تائید میں آپ ماہرین علم النفس کی تصانیف ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میر صاحب کے کلام میں درد کا پہلو خصوصیت سے غالب کیوں ہے؟ اسکی وجہ ذکی الاحساسی اور گدازی جذبات سے قطع نظر، خود ان کی وہ معاشرتی اور سیاسی تکالیف بھی ہیں۔ جو علوئے ہمت، قناعت پسندی اور نازک دماغی کی بدولت اُن کو آخری سانس تک جھیلنی پڑیں۔ بہرطور بالترتیب مطالعہ سے حیات مصنّف کے ذہنی ارتقا کی کیفیت اور اُن کے اسباب و علل سے پوری واقفیت ہوجاتی ہے۔

موازنہ

۲۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم جس شاعر یا نثار کا مطالعہ کرنا چاہیں ہمیں اُس کی حیات و تصانیف کا موازنہ پہلے اُس کے معاصرین کی حیات و تصانیف سے کرنا چاہیئے۔ اور اُس کے بعد ماقبل و مابعد کے مصنّفین کے مقابلہ میں حیات و تصانیف کو پڑھنا چاہیئے۔ مثلاً انیس کے کلام کا پورا جوہر اُسی وقت کھل سکتا ہے، جب ہم اُن کی حیات و مراثی کو اُنس، مونس، دبیر، ضمیر، تعشق، وعشق کے مقابلہ میں پڑھتے ہیں اور بعد کو اُن کے ماقبل مرثیہ گو، ہاشم، کاظم، ولی، میر، اور سودا وغیرہ اور مابعد کے مرثیہ گو اصحاب، اوج و عارف، نفیس، رشید، دولھا صاحب وغیرہ سے انکے واقعات، حیات و مرثیہ جات کا موازنہ کرتے ہیں۔ اس طور پر ہم کو تمام

متحد و مختلف خصائل و اطوار، صنائع و بدائع کا اندازہ کافی طور پر ہو جاتا ہے جو ہر ایک کے کلام کی جداگانہ یا یکساں ملکیت ہیں اور تصویر کے وہ تمام خط و خال روشنی میں آجاتے ہیں جو اس موازنہ کے پہلے نگاہوں سے اوجھل تھے۔

سیر، تذکرہ، حیات کا فائدہ

مطالعۂ مصنف میں سیر، تذکرے اور حیات بہت زیادہ معین ہوتے ہیں۔ مگر اس قسم کی تصانیف حقیقتاً اسم بامسمیٰ ہونی چاہئیں۔ اردو میں، سیر، تذکرے اور حیات کے متعدد نسخے مختلف ادوار کی یادگار موجود ہیں، لیکن اکثر ناکمل ہیں۔ یا غیر ضروری باتوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ پھر بھی اردو کے دامن میں کچھ اچھوتے موتی بھی موجود ہیں، مثلاً آب حیات، مراۃ الشعراء، خمخانۂ جاوید، عندلیب زار، سخن شعرا وغیرہ۔ مگر بعضوں نے حیات لکھنے کے مقاصد صرف یہ سمجھے ہیں کہ صرف غیر متعلق حالات کو کسی نہ کسی طرح ایک جگہ جمع کر دیں۔ مثلاً غالب کہاں پیدا ہوئے۔ ان کے گھر کا ساز و سامان کیا تھا۔ کس محلہ میں مکان تھا۔ شادی کہاں ہوئی۔ کتنے بچے پیدا ہوئے۔ حیات کا معیار بہت بلند ہونا چاہئے۔ مصنف کے متعلق ذیل کے امور بالتفصیل معلوم ہونے کی ضرورت ہے۔

تذکرہ یا حیات کی اہم شرطیں

۱۔ تعلیم و تربیت کس طور پر ہوئی اور کہاں تک ہوئی؟
۲۔ اس کے اخلاق و عادات، افعال و خصائل کیا تھے؟
۳۔ اس کا ماحول زندگی، فضائے حیات اور صحبتیں کیسی تھیں؟
۴۔ اس کی زندگی کس کس شان سے بسر ہوتی رہی؟
۵۔ اس کے دور حیات میں قومی کارنامے کیا کیا ہوئے؟

۶۔ زندگی کے مختلف ادوار میں ذہنی ارتقار کے اسباب وعلل کیا کیا ہوتے رہے ؟

۷۔ سیاسی حالت کیا تھی ؟

۸۔ اس کے دور حیات میں ایسے مذہبی، اخلاقی، مجلسی، اور مدنی انقلاب کیا ہوئے، جن کے اثر سے اسی کا کلام متاثر ہوتا رہا ہو؟

۹۔ اُس کے حیات و کلام میں کتنی خاص خوبیاں اور کتنی مشترک خوبیاں ہیں ؟

۱۰۔ اُس کے حیات و کلام میں اگر کچھ خامیاں ہیں تو کیا ؟

۱۱۔ اُس کے معاصرین کا خیال خود اُس کے بابت اور اُسکی تصانیف کے بابت کیا تھا ؟

بعض لوگوں کا اعتراض ہے کہ سیر یا تذکرہ، یا تنقیدی کتابیں قاری اور مصنف کے درمیان پردہ کی طرح حائل ہوجاتی ہیں اُسی حد تک یہ اعتراض بجا ہے مگر بعض مواقع پر یہی تنقیدی کتابیں وہ کام دیتی ہیں جو اصل سے بھی نہیں نکل سکتا۔ لیکن ان تمام خوبیوں کے حاصل ہونے کے بعد بھی ایسی تصانیف اصل کلام کا بدل نہیں ہو سکتیں۔ گویا کلام دُلھن ہے اور تذکرہ اسی کا سنگار ہے۔

طرز یا رنگ

طرز کی خصوصیت | طرز ہی وہ چیز ہے جو مصنف اور شاعر کو نہ صرف غیر شاعر و غیر مصنف سے ممیز و ممتاز کرتی ہے۔ بلکہ

خود ایک شاعر یا مصنف کو تمام دیگر شعرا اور مصنفین سے ممتاز کر دیتی ہے۔ شاعر کی طرزِ ادا کے لئے اردو میں جو دوسرا لفظ مروّج ہے وہ "رنگ" ہے کیا ہم عام طور پر نہیں کہتے کہ غالب کا رنگ فلسفیانہ اور آتش کا رنگ رندانہ تھا۔

فائدہ

شاعر یا ادیب اس نگاہ سے بھی زبان کا محسن ہے کہ وہ بہت سے الفاظ یا محاورات میں اپنی خاص طرزِ ادا یا اسلوبِ بیان سے نئی روح پھونک دیتا ہے۔ دنیا کی ہر زبان کے دورِ اول میں، زبان کی درستی وصفائی کا سہرا، زیادہ تر شعرا کے سر رہا ہے۔

خاص شان

اکثر یہ ہوتا ہے کہ نکتہ شناس حضرات ایک مصرعہ یا ایک فقرہ سن کر بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں۔ یہ تو میر تقی کا مصرعہ ہے۔ یہ تو آزاد کا فقرہ ہے۔ ذرا سمجھئے تو اس فیصلہ کی وجہ کیا ہے۔ لوگ غیب داں تو ہوتے نہیں، نہ ہر شخص ہر مصنف یا کسی مصنف کا حافظ ہوتا ہے۔ پھر کسی کا ایسا برجستہ فیصلہ کر دینا کہاں تک قابل توجہ و پذیرائی ہو سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر زبردست مصنف کے مخصوص طرز میں ایک خاص اثر ہوتا ہے، جو دل و دماغ پر اپنا نقش بٹھاتا جاتا ہے اور یہ نقوش، انتخاب الفاظ، لطافت بیاں، موسیقی، ترتیب اور نزاکتِ خیال کی مدد سے روز بروز گہرے ہوتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ سننے والے کو بلا قصد صاحبِ طرز کا پتہ چل جاتا ہے اور اس کی زبان سے بے اختیار نکل جاتا ہے کہ یہ فلاں شاعر کا شعر ہے۔ یہ فلاں نثار کی عبارت ہے۔

ارکانِ طرز طرز کے ارکان عناصر ثلاثہ بن کر جلوہ گر ہوتے ہیں اور انھیں کی بدولت زبردست شاعر یا نثار کی طرز ادا غیر فانی ہوجاتی ہے۔

صداقت ا۔ پہلا رکن صداقت ہے۔ یعنی بہترین الفاظ کا انتخاب جو انتہائے وفاداری و صفائی سے مفہوم معنی کو ادا کرتے ہیں۔ منتخب الفاظ میں بھی کمال کے مختلف امتیازی درجات ہیں اور وہی مصنف فاضل ترین ہے جو عمدہ الفاظ سے بہترین الفاظ منتخب کرلیتا ہے۔ ایسے الفاظ جو تمام ہم معنی اور مترادف الفاظ کے مقابلہ میں اپنے اثر، خوبی، موسیقی اور وسعت کی وجہ سے کہیں زیادہ مؤثر، معنی خیز، جاذبِ نظر اور دلکش ہوتے ہیں مگر یہ انتخاب عملاً نہایت مشکل ہے۔ اس جگہ یہ امر فراموش نہ کرنا چاہئے کہ انتخاب الفاظ سے زیادہ مہتم بالشان، زیادہ ضروری اور زیادہ مشکل، انتخاب خیالات ہے، ورنہ نظم یا عبارت محض بے فصل کی شاداب چنبیلی کی کلیاں ہو کر رہ جاتی ہے۔ جس میں نہ تو روح پرور خوشبو ہوتی ہے اور نہ نظر نواز رنگ ہوتا ہے۔

فلاسفہ، حکمار، عقلا، اور ادبا سب اس امر پر متفق ہیں کہ صداقت غیر فانی ہے اور جس چیز میں بھی یہ جوہر موجود ہو ظاہر ہے کہ وہ چیز بھی غیر فانی ہوگی۔ انیس کو انتخاب خیالات و الفاظ میں بڑا ملکہ تھا۔ اسی لئے اُن کا کوئی مصرعہ لے لیجئے اور چاہئے کہ کہیں سے کوئی لفظ بدل دیا جائے تو زمین و آسمان کا فرق ہوجاتا ہے۔ مثلاً

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا — تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

اوس کو شبنم سے۔ موتی کو گوہر سے۔ یا صحرا کو جنگل سے بدل دیجیے، تو سارا لطف جاتا رہتا ہے یا ۔۔ ع

«جنگل تمام باس سے پھولوں کے بس گیا» باس کو بو، خوشبو، شمیم، نکہت سے جنگل کو صحرا یا وادی سے، پھولوں کو گلوں سے بدل دیجیے، دیکھیے کیا فرق ہو جاتا ہے۔

فردیت

۲۔ فردیت۔ جیسا پہلے عرض کیا جا چکا ہے ہر زبردست ادیب میں کچھ خوبیاں مشترک و عام ہوتی ہیں۔ مگر مخصوص خوبیوں کی ایک شان ہوتی ہے جس کو فردیت کہتے ہیں، جس طرح انسان، بہت سے اعضائے ظاہری اور قوائے باطنی میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوئے ہوتے ہیں مگر اپنے رنگ و روپ، نقشہ، چہرہ اور خط و خال میں انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ بعینہٖ یہی حال شعرا و ادبا کا ہے۔ یہ اصول صرف اردو ادب کے لیے مخصوص نہیں۔ دنیا کا ہر ادیب خواہ کسی زبان کا ہو، اس کے دائرہ میں آ جاتا ہے۔ خود آپ دیکھ لیجیے۔ انیس کی بلاغت، دبیر کی فصاحت، میر تقی کا درد، سودا کی شگفتگی، شبلی کی سادگی، آزاد کی مصوری، حالی کی ترتیب، ولی کی برجستگی، سرسید کا تبحر، عبدالماجد کا زور بیان، اقبال کی قوم پروری، سرشار کی رنگینی، شرر کی ندرت، چکبست کی جدت، گرامی کا علم محسن الملک کی روانی، محمد علی کی بندش، صفی کی تلاش، اور اکبر الہ آبادی کی ظرافت و موسیقی، ہر ذات کے لیے مخصوص ہے۔ کہیں بعض صاحب یہ نہ سمجھیں کہ میں نے اور ادبا یا شعرائے اردو کا تذکرہ اس سلسلہ میں نہ کرکے

اُن کی حق تلفی کی ہے۔ یا اپنی جہالت و تعصب کا ثبوت دیا ہے۔ نہیں بات یہ ہے کہ میں نے بلا خیال زمانہ و انتخاب چند ہستیوں کو فردیت کے مثال میں پیش کر دیا ہے۔ ورنہ ہر دور میں بہت سے نام اور گنوائے جا سکتے ہیں، جو کسی نہ کسی خاص طرز کے موجد یا مالک رہے ہیں۔

پاکیزگی حیات

۳۔ پاکیزگی حیات ہے، انسان کے خصائل و عادات، افعال و اعمال کا اثر جس قدر اُس کے کلام اور تحریر پہ پڑتا ہے، اتنا اور کسی چیز پہ نہیں ہوتا۔ بعض فلاسفۂ یونان اور حکمائے مصر سے قطع نظر تمام عالم کے نزدیک یہ اصول مسلم الثبوت ہے کہ اُن کی تحریر، اُن کے حیات کا آئینہ ہوا کرتی ہے۔ ماہرین علم النفس نے دلائل و براہین سے ثابت کر دیا ہے۔ فطرتِ انسانی اپنے ماحول سے ہر وقت متاثر ہوتی رہتی ہے۔ اور تحریر کیا ہے؟ انھیں تاثیرات کی مادی تصویر ہے۔ لہٰذا تحریر بھی اُتنی ہی پاکیزہ ہوگی، حیات میں، تمام افعال ذہنی و جسمانی شامل ہیں۔ یہ پاکیزگی ایک روح افزا ہستی رو ہے جو صرف پیکر ادا میں جان ہی نہیں ڈال دیتی بلکہ پڑھنے والوں کو بھی "پیمانۂ جوش، ساغر ذہانت اور الہامی مسرتوں کے دو آتشہ سے سرشار کر دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ آج سے ہزارہا برس پہلے کی تصانیف آج بھی زندہ ہیں۔ اور اس طور پہ زندہ ہیں کہ ہم اُن کی زندگی محسوس کرتے رہتے ہیں۔

کسی قوم کی تاریخ اُٹھا کر دیکھ لیجیے، جتنے زبردست حکما، فلاسفہ، سائنس داں، شاعر یا ادیب گذرے ہیں سب کی حیات پاکیزہ ترین

طور پر بسر ہوئی ہے۔

جب یہ تینوں اراکین اپنی صحیح ترتیب و تناسب کے ساتھ کسی ذات میں جمع ہو جاتی ہیں تو وہ ذات اُسی تناسب کے اعتبار سے کامل، کامل تر، کامل ترین یا اکمل ہو جاتی ہے۔

قومی ادب

جس طرح تصنیف و مصنّف کا مطالعہ نتیجہ خیز ہے۔ اُسی طرح مصنّف کے معاصرین اور اُس کے دورِ حیات کا تعلق دوسرے مدارج و منازل ادب سے معلوم کرنا بیحد مفید ہے۔

مصنّف کے خیالات کی وسعت

ہر مصنّف اپنے ادب کے سلسلۂ مصنّفین میں زنجیر کا ایک حلقہ ہے جو سب سے جُدا بھی ہوتا ہے اور اور ہر ایک سے بالواسطہ یا بلا واسطہ واصل بھی رہتا ہے۔ اُس کی ذات میں مستقبل و ماضی کے بہت سے نکات حال بن کر جمع ہو جاتے ہیں۔ آنکھوں سے اکثر ظاہری حجاب اُٹھ جاتے ہیں۔ دماغ جام جمشید بن جاتا ہے اور اس طور پر نہیں کہ مصنّف صرف واقعات گذشتہ پر رائے زنی کرے بلکہ آئندہ حالات کی سیر بھی اس طرح کر لیتا ہے گویا اس کے سامنے گذرتے ہوں۔

فائدہ

اگر یہ ملکہ زبردست مصنّفین کو حاصل نہ ہوتا تو اُن کی تصانیف کا یہ اثر جو ہے آنے والی نسلوں کے ساتھ گھٹتے گھٹتے معدوم ہو جاتا۔ ارسطو یا سقراط کو آج تین ہزار برس سے زائد ہوئے مگر ان کی تصانیف

اُٹھا کر دیکھئے تو اکثر چیزیں ایسی محسوس ہوتی ہیں گویا خاص طور پر ہمارے لئے لکھی گئی ہوں "

وسعتِ تصوّر

اس کی وجہ کوئی سحر، منتر جنتر، طلسم یا معجزہ نہیں، صرف بات یہ ہے کہ وہ اپنے تمام قوائے ظاہری و باطنی کو صحیح مصرف میں لاتے تھے۔ جس مضمون کی تہ پر نہایت غور و غور و خوض اور فکر و محنت کے ساتھ پہونچ لیتے تھے۔ اُسی کا اظہار نہایت راستی و دیانت داری سے کرتے تھے۔ ہم کو چاہئے کہ کسی مصنف کا بالترتیب و بالاستیعاب تاریخی مطالعہ کرتے وقت، مصنف کے زمانۂ حیات، قومی جذبات، ملی تحریکات، ملی محسوسات، سائینس کی ترقیات، علوم کے انکشافات سیاحت کے تجربات، اور معاشرت کی تبدیلیوں کا منتظم مشاہدہ کریں۔ ان میں سے ہر چیز اُس کی تصنیف پر بہت زیادہ روشنی ڈالتی ہے۔

قومی ادب اور خاص دور

مگر قومی ادب سے نہ تو ذہنی اور معاشرتی ترقیوں کے کارنامے مراد ہیں نہ وہ تمام کتابیں جو کسی دور خاص کی ماحصل ہوں۔ بلکہ اُن خاص کتب کا ذخیرہ مراد ہے جو اپنے دور کو ماقبل و مابعد کے ادوار سے ممتاز کر سکیں۔

نرالا ادیب

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی خاص دور ادبیہ میں ایک ایسا شاعر یا ادیب پیدا ہوجاتا ہے۔ جس کا رنگ اپنے تمام معاصرین سے قطعًا جُدا گانہ ہوتا ہے۔ مثلاً غالب جن کا فلسفیانہ رنگ کسی اور میں نہیں پایا جاتا۔ یا محمد حسین آزاد جنھوں نے اُردو نثر میں ایک نئے طرز کا اضافہ

گیا۔ ایسے لوگوں کا مطالعہ اور زیادہ دلچسپ ہوتا ہے۔

ادبِ اُردو کے مختلف دور

امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اُردو ادب کی حالت بھی بدلتی رہی۔ پرتگالی انگریزی خیالات و الفاظ داخل ہونے گئے۔ شروع کے شعرا ہندی کی ترکیبیں، ہندی کی بحریں، ہندی کے الفاظ کثرت سے استعمال کرتے تھے۔ زمانہ حاضرہ کا انقلابی قرینہ بھی یہی کہتا ہے کہ آیندہ پچاس برس کے بعد ہندی کے بعض الفاظ و محاورات و محاکات، روزمرہ محاورات اُردو میں داخل ہوکر عام ہوجائیں گے۔

ضرورت

کاش اس تبدیلی کے ساتھ اُردو کے شیدائی تشبیہوں اور تمثیلوں میں مقامی رنگ کا خیال رکھیں۔ چنپا، پپیہا، نل دمن، بیلے چنبیلی، ستیا و ساوتری سے کام لیں تاکہ قومی و تاریخی، اخلاقی و علمی حیثیت میں بھی کسی اور زبان سے کم شمار جائے۔

اُردو کس کی زبان ہے؟

بے بنیاد جھگڑے

ہماری قومی بدنصیبی ہے جہاں مسجد کے سامنے باجہ بجنے اور گاؤکشی کے بے بنیاد مسئلوں پر صدہا بے گناہ جانیں تلف ہوتی ہیں۔ وہاں آج بیس پچیس برس سے وطن و قوم کے بعض نام نہاد اہل الرائے حضرات نے اُردو اور ہندی کا جھگڑا پیدا کردیا ہے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ جھگڑے والے لوگ سیدھا راستہ

چھوڑ کر یا تو خود بھٹک رہے ہیں یا بھٹکانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ *

ایک جماعت

ایک جماعت تو یہ کہتی ہے کہ اردو میں سوا بھاشا کے اور رکھا ہی کیا ہے؟ اس کی جو کچھ نشو و نما ہوئی ہے وہ ہندو مصنفین اور شعرا کی بدولت ہوئی ہے۔ مسلمانوں کو اسے اپنی زبان کہنے کا کیا حق ہے؟

دوسری ٹولی

دوسری طرف کی ٹولی نعرہ زن ہے کہ اکّے دکّے شاعر یا مصنف کو چھوڑ کر اردو نے جو کچھ ترقی کی ہے وہ مسلمانوں کے محلوں سے، مسلمانوں کی شاعری اور ادب سے کی ہے۔ اس میں جو چیز ہے وہ فارسی اور عربی کی شرمندۂ احسان ہے۔ ہندؤں کا حق اس پر کچھ نہیں ہے۔

سوال کی اہمیت

سیاسی نقطۂ نگاہ یا خود غرضی کے سطح نظر سے اردو، ہندی کی ملکیت کا سوال کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو، ادبی اعتبار اور فلسفیانہ حیثیت سے کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

صداقت

دونوں جماعتیں اپنے دعووں میں کسی حد تک درست ہیں مگر زیادہ حصہ محض تعصب یا بات کی پیچ ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ آج جو کچھ ترقی جس میدان میں بھی اردو نے کی ہے۔ اس میں مسلمانوں کی کوششیں زیادہ حصہ رکھتی ہیں۔

انگریز اور ہندو

اس کی دلیل میں کوئی تذکرہ کوئی تاریخ دیکھ لیجیے مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ انگریزوں نے زبان کو

منتظم و مرتب کرنے میں بہت زیادہ کوشش کی ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ ہندوؤں نے اُردو کی پیدائش سے لے کر اب تک بے نظیر طریقوں سے اُردو کی خدمت کی ہے۔ سرشار سا نثّار، چکبست سا شاعر کس قوم کے گوہر ہیں؟ رسالہ زمانہ، روزانہ تیج کس کی ادارت سے مستفید ہو رہے ہیں؟ سہیل علیگڑھ کی کسی گذشتہ اشاعت میں ہندو شعراء کے حالات چھپے تھے۔ اُنھیں دیکھ لیجیے تو قدر معلوم ہو جائے۔ کیفی دتا تریہ، نوبت رائے نظر معمولی پایے کے آدمی نہیں۔ میں نے صرف چند ہستیوں کا ذکر کیا ہے ورنہ ادب اُردو کی تاریخ میں جا بجا ہندو مصنّفین جلوہ گر نظر آئیں گے۔

اُردو کے سچّے مالک

خیر یہ حالات تو صرف آمد سخن میں لکھ دیئے گئے تھے۔ اب آپ ہی غور فرمایئے کہ اُردو کے متعلق یہ سوال کہ وہ پرتگالیوں کی ہے یا انگریزوں کی؟ مسلمانوں کی ہے یا ہندوؤں کی؟ دکھنیوں کی ہے یا پنجابیوں کی؟ کس قدر پوچ اور مضحکہ خیز ہے۔ میرے نزدیک کوئی زبان کسی قوم یا ملک کی ملکیت ہو ہی نہیں سکتی۔ اُردو بھی ہندوستان کی اور زبانوں کی طرح ایک زبان ہے۔ اور اس کے سچّے مالک وہی ہیں جو اس کی سچّی خدمت کر سکیں خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو، انگریز ہوں یا پرتگالی، یا دنیا کے کسی قوم و ملک کے رہنے والے ہوں

ادب کے دو خاص حصّے نظم و نثر

تعلّق

فطری نقطۂ نگاہ سے ادب دو حصّوں میں تقسیم ہو سکتا ہے۔ یعنی

نظم و نثر۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے متبائن نہیں ہیں۔ نہ ان میں کسی قسم
کی ضد و مخالفت ہے۔ نظم و نثر ایک ہی تصویرِ خیال کے دو رُخ ہیں۔ اور
اظہارِ تخیل کا ذریعہ و آلہ ہیں۔

فرق

ادبی حیثیت سے نظم و نثر میں بہت لطیف فرق ہے۔ عام طور پر
جو کلام بحور و قوافی، ردیف و وزن سے آراستہ ہوتا ہے، نظم کہلاتا
ہے۔ اور جس میں کوئی قید نہیں ہوتی نثر سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ امتیاز کچھ زیادہ
وقیع و سنگین نہیں ہے۔ اوزان و قوافی عناصر و ارکانِ نظم ارتقائے کلام انسانی
کے ساتھ ساتھ بنتے گئے ہیں اور مختلف زبانوں میں مختلف شکلیں اختیار
کرتے گئے ہیں۔

نظم کی خصوصیات میں ایجاز یا اشارہ بہت زیادہ وقعت کا حامل
ہے۔ نشست الفاظ اور تحریر موزوں سے چند لفظوں میں اتنے معنی پیدا
ہو جاتے ہیں، جن کے بیان کرنے کے لئے نثر میں دفتر کے دفتر مطلوب ہیں۔

نثر کی بعض قسمیں

اردو نثر میں کئی قسمیں ہیں۔ یعنی عاری، مرصع،
مسجع و مقفیٰ اور نثر منظوم۔ عاری وہ ہے جس میں
سادہ سے سادہ الفاظ میں مطلب بیان کر دیا جائے۔ مرصع وہ ہے جس میں
استعارات، تشبیہات یا دیگر صنائع صرف کی گئی ہوں۔ مسجع و مقفیٰ وہ رنگین
عبارت ہے جس میں صنائع و بدائع کے ساتھ قوافی کا التزام بھی کیا گیا ہو۔
اردو ادب کے ہر دور سے ہر طرح کی نثر کے نمونے مل جاتے ہیں۔ نثر
منظوم وہ ہے جو اپنے ایجاز و اشارات، معنی خیزی اور نظم الصوات کی وجہ سے

نثر سے کچھ زیادہ اور نظم سے کچھ کم ہو۔ اگر نظم کی خصوصیات کا پہلو غالب ہے تو نظم منثور کہیے ورنہ نثر منظوم کہنا صحیح ہے۔

نظم کو نثر پر ترجیح ہے

ایجاز ہماری زندگی کی ابتدا اور ہمارے تکلم کا آغاز ایجاز یا اشارات سے ہوتا ہے۔ دیکھیے شیر خوار بچے ایک لفظ مَمْ (پانی) یا دُدُّو (دودھ) سے اتنا کچھ کہہ گزرتے ہیں جو نثر کے پورے فقرات سے ادا ہو سکتا ہے۔

اشارات شاید آپ یہ اعتراض کریں کہ دودھ پیتے بچوں کے پاس ادائے مطلب کے لئے الفاظ نہیں ہوتے۔ اس لئے وہ صرف ایک لفظ سے ایک فقرے کا کام لیتے ہیں۔ بیشک یہ اعتراض ایک حد تک درست ہے مگر اس سے ہمارے کلیہ پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ دنیا کے زبردست ناظم و شاعر اکثر اشاروں پر اکتفا کرتے ہیں اور بیشتر موقعوں پر بالقصد بہت کم الفاظ استعمال کرتے ہیں تاکہ ہر شخص بقدر وسعت ادراک لذت اندوز ہو سکے۔ بچوں کی صورت میں الفاظ کا اخفاء و اختصار بلا قصد ہوتا ہے اور ناظم قصداً وہی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس طور پر فرق محض قصد و عدم کا ہے نہ کہ نفس در اصل میں کوئی تفریق ہے۔

سحبان کی حکایت غالباً اس موقعہ پر عرب کے زبردست شاعر سحبان اور ہندوستان کے بے مثل ناظم انیس کے بچپن کی حکایتیں دلچسپی سے خالی نہ ہوں گی۔ مشہور ہے کہ سحبان پانچ چھ

برس کا تھا کہ ایک روز اپنے باپ سے کسی کیڑے کا ذکر کرنے لگا مگر کمسنی کی وجہ سے نام نہیں بتا سکا۔ کہنے لگا کہ وہ کیڑا سیاہ رنگ کا تھا۔ مخطط تھا اور اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے شکل بنا کر اتنا بڑا تھا۔ تشریح اتنی مکمل اور تصویر ایسی صاف تھی کہ سننے والے فوراً اس کیڑے کو سمجھ گئے۔ باپ خوش ہو گیا اور برجستہ کہنے لگا کہ میرا بیٹا زبردست شاعر ہو گا اور ہوا بھی یہی۔ سحبان کا باپ غیب داں یا نجومی نہ تھا۔ اُس نے قرائن سے سمجھ لیا کہ جو بچہ صرف چند الفاظ میں ایک ایسے کیڑے کی پوری تصویر کھینچ سکتا ہے جس کے نام سے بھی وہ ناواقف ہے۔ تو

شعر

لڑکپن ایسا ہے جس کا شباب کیا ہو گا جو لاجواب ہے اُس کا جواب کیا ہو گا

یہی بچہ بڑا ہو کر افصح الفصحا و ابلغ البلغا ہو گیا۔ جس اصطلاح اور محاورے کو یا بقول بعضے جس لفظ کو ایک بار استعمال کرتا تھا پھر اُس کو سال بھر تک دہراتا نہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس استعمال کی وسعت میں عربی زبان کا فیض بھی بہت کچھ شامل تھا۔ جس میں صرف ایک اونٹ کے لئے ہزارہا لفظ موجود ہیں۔ پھر بھی ایک مطلب کے لئے سال بھر تک نئے نئے محاورات کا استعمال نہایت قابل قدر ہے۔ سحبان کی عظمت کا اندازہ شیخ سعدیؒ کے اس شعر سے ہو سکتا ہے۔

تواں در بلاغت بہ سحبان رسید نہ در کنہ بیچون سبحان رسید

سحبان کا ہمسر شیخ | سعدیؒ کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں۔ فارسی میں پیغمبر سخن

یا ...

در شعر سہ تن پیمبرانند ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را فردوسی و انوری و سعدی

سعدی علیہ الرحمہ کی رائے کوئی معمولی رائے نہیں ہے اور ان کی رائے میں سحبان کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ وہاں تک شاید ہی کوئی انسان پہنچ سکے! سحبان بھی ابلغ البلغاء سہی انسان تھا مگر یہ دیکھیے کہ راز خداوندی کے عارف ہو جانے کو ناممکن ٹھیرانے کو ناممکن ٹھہرانے کے لیے جس ممکن چیز کا ذکر کیا ہے وہ بھی پہ اُنس خود کس درجہ بلند و رفیع ہوگی۔

انیس کی حکایت انیس کے لیے بھی مشہور ہے کہ بہت چھوٹے سے تھے۔ شاید چھ برس کا سن رہا ہو کہ عیدالضحیٰ میں بکری کی قربانی دیکھ کر فرمایا۔ "آنکھیں تو کھلی رہ گئیں اور مرگئی بکری" آپ ہی بتائیے اس سے زیادہ مکمل تصویر کیا کھینچی جاسکتی ہے۔

انیس کا پایہ ظاہر ہے کہ آج انیس کا جو پایا ادب اُردو میں ہے وہ سحبان کے برابر نہ سہی تو اس سے کم بھی نہیں ہے۔

نظم اور شعر

مخصوص الفاظ انگریزی اور عربی میں نظم و شعر کا فرق قائم رکھنے کے لیے ادبا نے دو لفظ مقرر کردئے ہیں۔ ایک تو پوئٹری ہے۔ دوسرا ورس یعنی ایک نظم ہے دوسرا شعر۔

فرق مدارج شعر اور نظم میں وہی تعلق ہے جو خیال اور لفظ میں ہے

وہ شاعرانہ کیفیت جو کسی چیز کے مشاہدہ یا فکر سے، حسن یا جلوہ بن کر شاعر کے دماغ میں حواس خمسہ کی مدد سے، یا دیگر قوائے ذہنیہ کے توسل سے پیدا ہوتی ہے نظم کہلاتی ہے۔ اسی کو ابن رشیق، محقق طوسی وغیرہ نے کیفیت تخیل سے تعبیر کیا ہے۔ جب تک نظم ذہنی درجات میں ہے، غیر محسوس ہوتی ہے۔ یعنی شاعر ہی اس کیفیت کو محسوس کرتا ہے۔ مگر شاعر کے علاوہ اور کوئی دوسرا اس کا احساس نہیں کر سکتا۔ اور جب وہی کیفیت لفظوں کا جامہ پہنکر سامنے آجاتی ہے، تو سماعت و بصارت وغیرہ سے محسوس کی جاسکتی ہے۔

محویت و کیفیت

کیا آپ نے کبھی خیال نہیں کیا کہ شاعر نے کسی خوبصورت چیز کو دیکھنا شروع کیا ہے اور تھوڑی دیر بعد اس میں اس قدر محو ہوگیا ہے کہ نگاہیں تو اس چیز کی جانب ضرور رہتی ہیں مگر دراصل وہ محض اس کے حسن و جمال کو دیکھتا رہتا ہے، جس کی کیفیت سے اس کا دل و دماغ لبریز ہوتا ہے۔ اس کیفیت سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت ہر شخص میں فطرتاً موجود ہے۔ ورنہ نظام فطرت کو ناقص اور ناظم فطرت کو غیر عادل ماننا پڑے۔ مگر نظم کو شعر میں لانے کا سلیقہ ایک خاص حد تک اکتسابی ہے اور اکثر اشخاص تاثر، تربیت یا اثرات ماحول کی ناموزونیت سے یہ سلیقہ حاصل نہیں کر سکتے۔

نظم کیا چیز ہے؟

ضروری تعین

نظم جیسا پہلے عرض کر چکا ہوں، ہمارے ضمیر کا جزو ہے

ہے۔ اور داخلی ہونے کے اعتبار سے محض محسوس کئے جانے اور لطف اندوز ہونے کے قابل ہے۔ اس تمام پہلو کا احاطہ فہم و قیاس کی قیود سے آزاد ہے ادبی نقطۂ نگاہ سے اب ہم جہاں کہیں نظم کا لفظ استعمال کریں گے وہ شعر کے معنوں میں ہوگا۔ اس لئے کہ تنقید و تبصرہ، تقریظ و تزکیہ سب اسی حالت میں ممکن ہے۔ جب کیفیتِ داخلی، لفظوں کے جامہ میں آ جائے۔

بعض تعریفیں

ذیل میں ہم یورپ اور ایشیا کے بعض زبردست ناقدین و متکلمین کی تعریفوں کے خلاصے درج کرتے ہیں جو اگرچہ انفرادی حیثیت سے غیر مکمل ہیں اور صرف کسی ایک پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں مگر مجموعی طور پر تقریباً تمام ممکن خوبیوں کا احصار کر لیتے ہیں۔

نفیس عبارت

۱۔ نظم، بحور کی پابندی کے ساتھ ایک نفیس عبارت ہے۔ بحور سے یہاں ملا خلیل کی چودہ بحریں یا اکیس زحافات مروجہ مراد نہیں ہیں بلکہ کسی زبان کے مروجہ یا ممکن بحور سے مطلب ہے۔ نفیس عبارت سے یہ مطلب ہے کہ قواعد و ضوابط کی میزان پر پوری اترے۔ مطلب کے سمجھنے میں تکلف نہ ہو۔ حشو و زوائد سے پاک ہو۔ جیسے۔ ؎

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

مسرت و صدق کی یکجائی

۲۔ دلائل اور تصورات کی مدد سے مسرت و صدق کی یکجائی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ حسن تصور کے ساتھ صدق و مسرت کا پہلو چھوٹنے نہ پائے۔ شاعر کے دلائل منطقیوں اور فلسفیوں

کے براہین سے جُدا گانہ ہوتے ہیں۔ کبھی وہ مخاطب کے ذہن کو تجربات اور واقعات کی طرف منتقل کرکے اپنے دعوے کو ثابت کردیتا ہے۔ کبھی مختلف اثرات پیدا کرکے اپنی بات کی سچائی ثابت کرتا ہے۔ اور سچی بات عام طور پر مسرت انگیز ہوتی ہے۔ مثلاً

کیسا صورت آفریں ہے تیرا رنگِ خیال　　نقش مٹ مٹ کر ابھرتے ہیں تری تصویر کے

خیالات و الفاظ کا مجموعہ

۳۔ خیالات و الفاظ کا مجموعہ ہے، جس میں جذبات کا رنگ غالب رہتا ہے۔ اگر جذبات کا رنگ غالب نہ رہے تو سامع و مخاطب کے دل و دماغ پر عالمگیر تاثیر پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ جیسے

ابن مریم ہوا کرے کوئی　　میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

مکمل تصویر

۴۔ الفاظ سے ایسی تصویر کھینچ دینا جیسا باکمال مصور مختلف رنگوں کی مدد سے کھینچتا ہے۔ اسی لئے بعض زبانوں میں کامل مصور اور کامل شاعر یکساں سمجھے جاتے ہیں۔ یعنی مصوری و شاعری کا وجود (فنون لطیفہ کے ارکان ہونے سے قطع نظر) تکمیل ادب کے لئے لازمی قرار دیا گیا ہے۔ جیسے۔ ؎

یہ رات اندھیری یہ ڈرونا جنگل　　اصغر مرے قبر میں اکیلے ہوں گے

موسیقی انگیز خیال

۵۔ ایک موسیقی انگیز خیال ہے جو الفاظ کے جامہ میں جلوہ گر ہو۔ جیسے۔ ؎

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی　　عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

تصور کا اظہار | ۶۔ شعر تصور کا اظہار ہے۔

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

جذبات کا ترجمان | ۷۔ شعر تصور و جذبات کا ترجمان ہے۔ مثلاً

یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں
کہیں نظر نہ لگے اُن کے دست و بازو کو

روحِ معلومات | ۸۔ روحِ معلومات ہے۔ جیسے

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

فلسفۂ حیات | ۹۔ ناظم کے فلسفۂ حیات کی تصویر ہے۔ جیسے۔

نمود و بود کو عاقل حباب سمجھے ہیں
وہ جاگتے ہیں جو دنیا کو خواب سمجھے ہیں

حسن کا مقفیٰ مرقع | ۱۰۔ حسن و جمال کا مقفیٰ مرقع ہے۔

یہ حسن اور اُس پہ عالم شباب کا
دامن میں تم تو پھول لئے ہو گلاب کا

حسن کی مادی تصویر | ۱۱۔ کیفیاتِ حسن و تصور کی مادی تصویر ہے۔ مثلاً

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں میں ضعفِ پیری نے
چُنا ہے جامۂ اصلی کے آستینوں کو

اختلاف کا سبب | تعریفِ شعر کے اختلاف اور پیچیدگی کا سبب محض مذاق و معیار کا اختلاف ہے۔ اگر یہ تمام تعریفیں ایک ساتھ جمع کر لی جائیں تو بھی نظم کی پوری حقیقت ظاہر نہیں ہو سکتی۔

انسان کی کم مائیگی | ہمارا علم ایک ناچیز قطرہ کی طرح ہے اور ہماری جہالت ایک بحرِ ذخار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لئے ہم اپنی پسند کے مطابق اور اپنی معلومات کے معیار سے جو کچھ اور جتنا کچھ

دیکھتے ہیں۔ اسی کو سب کچھ سمجھنے لگتے ہیں۔ مجھ کو اس وقت بے اختیار ایک حکایت یاد آرہی ہے جو حسب حال ہے۔

ایک دلچسپ حکایت

سُنتے ہیں بہت دن ہوئے اندھوں کے گاؤں سے ایک دفعہ ہاتھی کا گذر ہوا، گاؤں والے جمع ہوئے اور ہاتھوں سے ٹٹول کر ہاتھی سے واقفیت حاصل کی جب ہاتھی چلا گیا اور آپس میں بحث ہونے لگی تو ایک نے کہا "وہ بالکل تنے کی طرح تھا" دوسرے نے کہا "ببول کی ڈال کی طرح تھا" تیسرے نے کہا "تمباکو کے پتے کی طرح تھا" غرض جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں تھیں۔ ہر شخص اپنی جگہ سچا تھا مگر ہر شخص دوسرے کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور لڑنے مرنے کے لیے تیار تھا۔

نظم کی لطافت

بعینہ یہی حال اُن تمام متعصب اور کم نظر عقلا و ادبا کا ہوا ہے۔ جنھوں نے صرف اپنے ملک و قوم کے ادبی معیار سے دنیا کے اور تمام زبانوں کی ادبیات کو جانچنا چاہا ہے۔ نظم ایسی لطیف کیفیت کو چند مادی لفظوں میں لوگوں نے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں کسی حد تک کامیابی ضرور ہوئی ہے۔ مگر بلحاظ مجموعی اُن کی تعریف "چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند" ہو کر رہ گئی ہے۔

نظم کی تاثیر عالمگیر ہے

نظم کا اثر سب پر ضرور ہوتا ہے مگر ہر ہستی پر ایک طرح کا اثر نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ ہر فطرت کا درجۂ استدراک و معیارِ حسن جداگانہ ہے۔ لہذا ہر شخص قصداً یا بلاقصد

اپنی قابلیت درک کے تناسب سے اثر پذیر ہوتا ہے۔

ایک انگریز کی حاضر جوابی

اس سلسلہ میں مجھے ایک انگریز فلسفی کی حاضر جوابی نہ بھولے گی۔ جب لوگوں نے ماہیت نظم کے متعلق سوالات کرتے کرتے پریشان کردیا تو اُس نے مسکراکر کہا "اگر مجھ سے نہ پوچھئے تو میں جانتا ہوں کہ نظم کیا چیز ہے اور اگر پوچھیے کہ نظم کیا چیز ہے تو میں کچھ نہیں جانتا۔

احساس و بیان کے فروق

واقعی امر یہ ہے کہ بہت سی باتیں ہیں جو نہایت عمدگی سے محسوس ہوتی رہتی ہیں۔ مگر بیان کرنے میں اُن کی پوری حقیقت ظاہر نہیں ہوسکتی۔ اس کی وجہ خواہ آپ کمی الفاظ پر محمول کریں خواہ ناقص ارتقار تکلم پر مبنی فرمائیں مگر واقعہ یہی ہے۔ اس کی تاثیر البتہ عالمگیر ہے اور تاریخ و تسخیر عالم دیکھ لیجئے۔ سیاسی انقلابات، مذہبی محاربات، ملکی تحریکات، صنعت و حرفت، تجارت و معاشرت، علوم وفنون کی نشر و ترقیات، آزادی کی جانفروشی کے معرکوں میں، بینڈ کے تاروں، کرکٹ کے کڑکوں، اور خوش گلو کے تانوں کے ذریعہ سے نظم سے زیادہ اور کوئی چیز موثر و محرک نہیں ہوتی۔

نظم و ناظم

جس طرح ہم ادب کو ادیب سے جدا نہیں کرسکتے۔ اسی طرح نظم و ناظم کو بھی الگ نہیں کرسکتے۔ لہٰذا ارکان نظم اور لوازم ناظم کا ذکر ایکساتھ

کیا جاتا ہے۔

فطری قابلیت

ا۔ فطری قابلیت سُننے میں یہ دو لفظ بہت آسان ہیں مگر میں نام لینا نہیں چاہتا۔ دنیا کے بعض زبردست ناقدین اور فلاسفہ کو ان الفاظ کے سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ فطری قابلیت سے ہرگز یہ مراد نہیں ہے نہ ہوسکتی ہے کہ بعض آدمی بالطبع نظم کے لئے موزوں ہیں اور بعض فطرتاً موزوں نہیں ہیں۔ اکثر عقلاء نے غلط مشاہدات اور سطحی تجربات سے اس امر پر زور دیا ہے کہ صرف وہی بچے جو عہد طفولیت سے نظم کی طرف فطرتاً مائل ہوتے ہیں، بڑے ہوکر کامیاب شاعر ہوسکتے ہیں۔ مجھے ان کے بیان پر حیرت بھی ہوتی ہے ہنسی بھی آتی ہے۔

قوانین فطرت عالمگیر ہیں

فطرت کے تمام قوانین عالمگیر ہیں۔ فطرت کی روح رواں خدا عادل خدا ہے۔ ورنہ خدا ہی نہیں ہوسکتا۔ موجودات کے کسی حصہ میں اور اشیاء کے کسی طبقہ میں آئین فطرت مختلف و متضاد نہیں ہوتا۔ نباتات کے درجات میں دیکھ لیجیے، حیوانات کے طبقات کی سیر کرلیجیے۔ تمام اعضاء داخلی و خارجی کے اعتبار سے حواس خمسہ، قوائے حیوانیہ، بہیمیہ یا دیگر قوی ہیں، ہر مرد دوسرے مرد کی طرح اور ہر عورت دوسری عورت کی طرح ہے۔ ان میں جہاں کہیں رنگ و نقشہ، خط و خال وغیرہ کے ثانوی فروق نظر آتے ہیں۔ وہ اضافی یا اکتسابی شان رکھتے ہیں۔ قوانین فطرت میں مستثنیات محالات عقلی سے ہیں۔ شاید آپ کہیں

یہ نظریہ عقلاً درست ہو مگر مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ بعض لوگ اندھے پیدا ہوتے ہیں بعض لنجے۔ بعض ضعیف الخلقت، ذرا سا غور فرمائیے تو ساری گتھیاں آپ سے آپ سلجھ جائیں۔ اندھے لنجے اور ضعیف بچے قوانین فطرت کے مختلف الاثر نتائج نہیں ہیں۔ بلکہ یہ کمزوریاں الفوق نے نطفۂ پدر یا رحم مادر کی کمزوریوں سے دراثتاً پائی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بظاہر وہ دوسروں کے مقابلہ میں ضعیف ناکمل اور بے بنیاد نظر آتے ہیں۔ مگر اُن کی فطرت میں اس کمی کے پورا کر لینے کی صلاحیت ضرور موجود ہوتی ہے۔

توریث

کیا آپ نہیں دیکھتے کہ طب اور جراحی کے معجزوں سے، ادویہ واغذیہ کے صحیح استعمال سے 'موقعہ اور محل کے علاج سے' ایسے بچے صاحب نظر' تندرست اور طاقتور ہوجاتے ہیں۔

مشق و ماحول

اور مزاولت و مشق کی وجہ سے تمام کمزوریاں دور ہوجاتی ہیں۔ اس لئے فطرتِ انسانی بقول فلاطون انتہائی درجہ کی اثر پذیر ہے، جو ہر وقت اپنے ماحول سے متاثر ہوتی رہتی ہے۔ غالبًا اب آپ کو بھی شبہہ نہ رہ گیا ہو کہ فطرتاً ہر شخص کی طبیعت میں نظم و نثر کے جوہر موجود ہوتے ہیں۔ خواہ کمی کے ساتھ ہوں یا زیادتی کے ساتھ ہوں۔

مشق و عدم مشق کے نتائج

مگر ایک پیچیدگی اب بھی باقی رہتی ہے۔ وہ یہ کہ ظاہراً بعض حضرات موزوں طبیعت ہوتے ہیں۔ اور بعض ایسے کہ ایک مصرع بھی صحیح طور پر نہیں پڑھ سکتے۔

بات یہ ہے کہ کچھ تو نقص توریث سے اُن کے قوائے ذہن، فکر، توازن، تناسب، ممیزہ، متفکرہ، متخیلہ، مدرکہ اور حاسہ بالطبع غیر مکمل ہیں۔ اور کچھ اسباب خارجی کی بدولت بے مشقی اور عدم مزاولت کے فیض سے اُن کی ذکی الاحساسی کم ہوتے ہوتے ناپید سی ہو جاتی ہے۔ غیر شعرا کی بے لطف صحبت، فضائے زندگی، اشتغال معیشت کی کثرت رفتہ رفتہ قابلیت و صلاحیت پر غالب آجاتی ہے۔ شاید اس موقعہ پر بھی بعض حضرات کو سمجھنے میں تکلف ہو۔ لہذا مثال کے طور پر وحشی بطوں اور اُسی نسل کی خانگی بطوں کو دیکھ لیجیے، آخر الذکر محض اپنے پر و بازو کے بے استعمالی کی وجہ سے رفتہ رفتہ قوت پرواز سے محروم ہو جاتی ہیں۔ اور آخر کار کاہلی و بے مشقی نسل در نسل منتقل ہوتے ہوتے اس قدر زیادہ ہو جاتی ہے کہ تعطل صلاحیت پرواز ہونے کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ بہر طور ہم کو قابلیت فطری سے یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ لوگ شاعری کے لیے بالطبع موزوں ہیں۔ جنھوں نے وراثتاً موزونی طبع پائی ہے اور جن کی نشو و نما مناسب ماحول و اثرات میں ہوئی ہے جنکو جوان ہوکر صرف رجحان ہی نہیں علم و ادب سے شغف ہو گیا ہے۔ وہی لوگ کامیاب اور فطری شاعر کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ دوسروں میں سرے ہی سے صلاحیت نظم مفقود ہے۔

علم

۲۔ علم۔ نظم و ناظم دونوں کے لیے علم نہایت ضروری ہے اور علم بھی سطحی یا ناکافی نہیں۔ بلکہ مکمل اور دقیق ہونا چاہیے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ میر، ولی، سودا، آزاد، انیس وغیرہ زندہ ہیں۔ اور آپ محسوس

کرتے ہیں کہ اُن کا کلام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ مگر اُن کے بعد ہزارہا نثار و شعرا صاحب تصانیف و دواوین ایسے گذرے ہیں۔ جن کو مقامی یا وقتی شہرت نصیب ہوئی۔ اور آج ہم اُن کا نام بھی نہیں جانتے۔ وجہ یہ ہے کہ ہر شاعر یا نثار کا کلام اُس کے تبحر علم کے تناسب سے غیر فانی ہوا کرتا ہے، جیسا میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں وہ حقیقت ہے۔ یعنی دنیا کا کوئی موضوع کوئی علم کوئی بحث کوئی فن ایسا نہیں ہے۔ جہاں ادب کا دخل اُسی وقت نہ ہو جائے۔

ادب کی وسعت

جب وہ اپنے استقلال و قیام کے لیے صفحات کاغذ پر عالمگیر دلچسپی کے ساتھ لفظوں کی صورت میں ضبط و نقش کر لیا جائے۔ اسی لیے ہر شاعر کو ضروری اور صحیح معلومات عامہ کا گنجینہ ہونا چاہیے۔ ضروری اس لیے کہ علم ایسا بحر بیکراں ہے جس کے کنارے بڑے سے بڑے عاقل و فاضل حکیم و فلسفی، بچوں کی طرح گوہر و جواہر کے دھوکے میں کنکر پتھر چنتے رہتے ہیں۔ اور صحیح اس لیے کہ اگر معلومات کا خزانہ غلط فہمی پر مبنی ہے، تو علم سے جہل بہتر ہے۔ ایسا شخص جو کسی ایک زبان پر پورا قابو رکھتا ہو اُس دوسرے شخص سے بدرجہا بہتر ہے جو صدہا کتابیں ازبر سنا سکتا ہو۔ مگر اُن کے معنی و مفہوم، حسن و نکات سے واقف نہ ہو۔ قابو رکھنے سے یہ مراد ہے کہ صحیح مطالب سے بہرہ رکھتا ہو۔ الفاظ و محاورات و مصطلحات روزمرہ کے حسن و نقص سے آشنا ہو، انکی تاریخ و ارتقاء سے کامل طور پر واقف ہو۔

تجربہ ۳۔ ناظم کے لیے تجربہ کار ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔ تجربہ ہی مشاہدات کا معیار، دوربینی کا آلہ، تجزیہ و تخرجہ کا ذریعہ صحیح نتائج مرتب کرنے کی بنیاد اور امتیاز کی کسوٹی ہے۔ مگر تجربہ بھی اچھا ہونا چاہیے۔ نا مکمل اور سطحی نہ ہونا چاہیے۔

راستی ۴۔ راستی ارکانِ نظم میں سب سے مہتم بالشان شے ہے۔ آج کلیہ دنیائے صحافت میں خصوصاً اور عالمِ ادب میں عموماً راستی سے کوئی سروکار نہیں رکھا جاتا۔ راستی بھی مختلف حصص میں تقسیم ہو سکتی ہے۔ خیالات کی راستی جسے ذہنی ایمانداری بھی کہتے ہیں۔ طرزِ بیان کی راستی، افعال کی راستی، معاشرت و اخلاق کی راستی ان سب کا اثر نظم پر بہ حیثیت مجموعی پڑتا رہتا ہے۔ بعض فلاسفہ یونان نے بالخصوص اور دنیا کے تمام زبردست انسانوں نے بالعموم یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان میں اگر راستی کا جوہر ترقی نہ پائے تو اُس کی کوئی بات غیر فانی یا عالمگیر اثر رکھنے والی نہیں ہو سکتی۔ صاف ظاہر ہے کہ وہی چیز راست ترین ہوگی، جو فطرتِ انسانی سے پوری پوری مطابق ہو جائے۔ آج کلمہ نظم مطابقِ فطرت یا نیچرل شاعری کے معنے عام طور پر بہت تنگ اور محدود طور سے سمجھے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ ان الفاظ سے محض فطری مناظر کی تصویر کشی مراد سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ محض جذبات کا بیان اور کچھ حضرات صرف قومی شاعری مراد لیتے ہیں۔

نیچرل شاعری مگر حقیقتاً نیچرل شاعری کا دائرہ بہت وسیع ہے، اور

مرتبت نفس درجہ راستی پر منحصر ہے۔ راستی طرز سے مطلب یہ ہے کہ جو الفاظ جس مطلب کے لیے منتخب کیے جائیں اُن سے وہی مطلب پورا پورا نکلتا ہو، دوسرے یہ کہ پروازِ تخیّل یا زورِ تصوّر اتنا زیادہ نہ ہو جائے کہ الفاظ اُن کا بار نہ اُٹھا سکیں۔ تیسرے یہ کہ ناظم اپنے خیالات و معلومات کا اظہار بالکل اسی طرح کرے جس طرح تجربہ و علم نے اس پر اثر کیا ہے۔ یہ نہیں کہ مافی الذہن کچھ اور ہے، الفاظ کچھ اور بتا رہے ہیں۔

سادگی راستی کا جزوِ اعظم سادگی ہے۔ اور سادگی ہی وہ فطرتی حُسن ہے، جو ہر تصویر کو اُس کے اصلی رنگ و روغن میں ظاہر کرتی ہے، مگر سادگی سے یہ مراد نہیں ہے کہ خیالات بھی سادہ، عامیانہ، سوقیانہ یا سطحی ہوں۔ سادگی کا اصل منشا یہ ہے کہ ہر لفظ، ہر اصطلاح، ہر جملہ،
ہر محاورہ اور ہر روزمرہ اپنے صحیح مقام و محل پر صحیح طور سے صرف کیا گیا ہو۔ ۵

داند آنکس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقعہ و ہر نکتہ مقامے دارد

اس جگہ ایک احتیاط اور رکھنی چاہیے وہ یہ کہ جس طرح زبان اور ادب میں فرق ہے۔ اُسی طرح عام خیالات اور نظم میں صوری و معنوی امتیازی درجات ہیں۔ ایشیا اور یورپ کی مختلف ادبیات کی سیر کیجیے، عام طور پر ہر ادب میں پہلا دور سادگی کا دور ہوا ہے۔ اس کے بعد صنائع و بدائع کا، اس کے بعد علمی و حکمی دور اور پھر ادب اپنے اصلی مرکز یعنی سادگی کی طرف واپس آیا ہے۔ لیکن یہی حال ادب اُردو کا ہے۔ نثر و نظم دونوں کے ابتدائی دور میں سادگی، برجستگی اور بے تکلفی رہی ہے۔

بعد کو تصنع، استعارہ اور مبالغہ کا دور ہوا ہے۔ اور اب قرائن حاضرہ سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ ادب اردو خیالات کے لحاظ سے نہیں، طرز تحریر کے اعتبار سے بہت تیزی کے ساتھ اصلی مرکز کی طرف واپس آیا ہے۔

موجودات کا حکیمانہ مطالعہ

۵۔ مطالعہ فطرت ناظم کے لئے لازم ہے کہ موجودات عالم کا مطالعہ حکیمانہ اور شاعرانہ نظر سے کرے۔ اور فطرت انسانی کی تمام گہرائیوں سے واقفیت ہونے کی کوشش کرے۔ مشاہدہ اور مطالعہ کا فرق ملاحظہ فرمائیے۔ مشاہدہ مکمل ہو کر مطالعہ ہوتا ہے۔ اور مطالعہ مکمل ہو کر تحقیق کا درجہ حاصل کرتا ہے۔ مگر صرف تحقیق ہی کافی نہیں ہے۔ ناظم کو چاہئے کہ اپنی ہر تحقیق کو عقل و ذکا کی کسوٹی پر کسے۔ ان کا ذہنی تقابل خود اپنے تجربات سے و نیز دیگر حضرات کی تحقیقات سے کرے۔ اور تمام نتائج کے ترتیب دینے میں بہت مستعدی و ہوشیاری سے کام لے۔ ان اثرات کو مدنظر رکھے جو مشاہدہ کے خلاف برسرکار ہوں۔ اپنے تعصب، مذاق یا ذاتی کیفیات کو جہاں تک بس چل سکے مطابق شامل مشاہدہ یا مطالعہ نہ کرے۔ مذاق یا ذاتی کیفیات سے بچ جانا، نگاہ اول میں کچھ دشوار معلوم نہیں ہوتا مگر حقیقت اس کے خلاف ہے۔ ہمارے اکثر مشاہدات اور غالب مطالعے محض انہیں کمزوریوں کی بدولت غلط نتائج میں تبدیل ہو کر رہ جاتے ہیں۔

آزادی رائے

علاوہ بریں ناظم کو شخصیت پرستی اور عقیدت مندی سے بچنے کی بھی بہت ضرورت ہے۔ تاکہ تنہا بہت

آزادی سے رائے قائم کر سکے۔ جس کے لئے صرف مناظرِ فطرت سے دلچسپی ہی کافی نہیں ہے۔ اُن سے ایک خاص قسم لگاؤ بھی ہونا چاہیئے اور خود نفس و فطرت میں ایسی قابلیت پیدا کرنی چاہیئے کہ فطری مناظر اور حادثاتِ عالم سے ناظم، غیر ناظمین کے مقابلہ میں، خاص طور پر متأثر ہو سکے۔ اُردو کے بڑے بڑے شاعر اور ادیب کسی نہ کسی درجہ میں ان تمام خوبیوں کے مالک اور ان تمام کمزوریوں پر غالب رہے ہیں۔

انتخاب

۶۔ انتخاب۔ ان عناصر کے بعد انتخاب کا درجہ ہے اور عملاً وہ بھی بہت مشکل ہے۔ عام طور پر معمولی درجہ کے ادیب اور ناظم انتخاب کی کشمکش سے بچنا چاہتے ہیں۔ اور جو خیال ذہن میں آتا ہے۔ اس کو برجستہ الفاظ میں فوراً منتقل کر دیتے ہیں۔

خیال کا انتخاب

مگر ایسی چیز وقتی تاثیر سے زیادہ اور کسی خوبی کی حامل نہیں ہوتی۔ سب سے پہلے خیالات کا انتخاب ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے دماغ میں ہر لمحہ ہر قسم کے خیالات آتے رہتے ہیں اور غم و غصہ، نفرت و حقارت، طعن و طنز، صدق و راستی، حسن و تہذیب وغیرہ کے جذبات موجزن ہوتے رہتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہم کو خیالات کا ذہنی جائزہ لینا چاہیئے۔ اور نظم میں صرف وہی خیالات، محسوسات، جذبات یا اثرات منتقل کرنے چاہئیں جو پاکیزہ ترین اور بہترین ہوں۔

الفاظ کا انتخاب

دوسرا انتخاب الفاظ ہے۔ بہت سے لفظ بظاہر مترادف و ہم معنی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر حقیقتاً ایسے

نہیں ہوتے۔ بہت سے لفظ سفید پوش، بدمعاشوں کی طرح ہیں جن کی ظاہری شکل وصورت پر دھوکا ہوجاتا ہے۔ اور اکثر لفظ کسی خاص محل کے لئے موزوں ہوتے ہیں۔ ہم کو انتخاب الفاظ کے وقت خیال رکھنا چاہیے کہ متروک نہ ہوں، غیر فصیح نہ ہوں۔ اور اپنے موقع ومعانی کے لحاظ سے جامع ومانع ہوں۔ یہ انتخاب اس وقت تک ناممکن العمل ہے، جب تک ناظم کا دماغ خزینۂ مشاہدات اور گنجینۂ معلومات نہ ہو۔ اس انتخاب کے لئے قوائے ممیزہ محرکہ متصورہ اور متخیلہ کی تہذیب نہایت ضروری ہے۔ ورنہ انتخاب میں نقص وکمزوری کا پہلو غالب رہے گا۔

موسیقی ۷۔ موسیقی۔ موسیقی اور شاعری کا ساتھ چولی اور دامن کا ہے۔ حالانکہ ایک حد تک نہ شعر موسیقی کا محتاج ہے۔ نہ موسیقی شعر کی دست نگر ہے۔ مگر جب یہ دونوں خوبیاں کسی کلام میں جمع ہوجاتی ہیں۔ تو وہ شعر مکمل شعر ہوجاتا ہے۔ ہر لفظ حقیقتاً حروف کا مجموعہ ہے۔ اور ہر حرف کسی نہ کسی خاص آواز کا حامل ہے جس کا تعین اجماع عقلاء کثرت آراء اور مزاولت عام کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی سے ظاہر ہے کہ الفاظ کے لئے موسیقی ناگزیر ہے۔ ہر لفظ میں کوئی نہ کوئی خاص نغمہ موجود ہے۔ جو لوگ اس کا خیال نہیں رکھتے۔ ان کے اشعار میں یا تو اثر ایک سرے سے ہوتا ہی نہیں یا بہت کم ہوتا ہے۔

حُسنِ سماعت موسیقی کا بہترین معیار حسن سماعت ہے اور متکلم کے وقت جن الفاظ سے سننے والا جس قدر متاثر ہو،

اُسی قدر اور اُسی انداز کے نغموں سے وہ الفاظ بھرے ہوئے ہوں۔ مگر صرف الفاظ کی موسیقی کافی نہیں ہے۔ شعر میں موسیقی کی خاص ترتیب ہونی چاہئے تاکہ الفاظ سے قطع نظر محض ترکیب اصوات سے جو اثر مطلوب ہو پیدا ہوجائے۔ خیالات، موضوع، الفاظ، موسیقی اصوات، ترکیب حروف میں پورا ملکہ ہونا چاہیے۔

ترکیب اصوات کے متعلق اثرات کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اردو شعرا نے بھی بہت سی ایسی زمینیں اختیار کی ہیں جن کی روانی یا آہستگی مختلف اثرات مسرت و غم کی حامل ہوتی ہے۔ غرض یہ سب ہنگ انتخاب کا جلوہ ہے۔ ورنہ شعر کیفیت و اثر سے خالی ہوگا۔

بحر، وزن، قافیہ و ردیف

اہمیت میں نے اس سے پہلے نظم اور شعر کا فرق مثالیں دے کر صاف دکھا دیا ہے۔ بحر، قافیہ، ردیف، نہ تو اس نظم کے لئے ضروری ہیں اور نہ فطرتاً کوئی شاعرانہ تخئیل ان قیود کے ساتھ دماغ میں آتی ہے۔

فائدہ شعر کے لئے قافیہ، ردیف اور بحر زیور ہیں جن سے بہتر تزئین نہیں ہوسکتی۔ مفید ہیں، اس لئے کہ بحور کی نزاکت و روانی، ترکیب اصوات کی موسیقی۔ قافیہ کی قیدیں اور ردیف کی پابندیاں اگرچہ دشوار گذار ہیں۔ مگر نفس مفہوم میں چار چاند لگا دیتی ہیں۔ یورپ کی اکثر مہذب زبانوں میں بعض خاص مسلسل اور طویل مضامین کے واسطے نظم معرا

Blank Verse کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

حقیقت اس کی شان ہی اور ہے۔ قوافی و ردیف یا بحور کے مفقود ہو جانے سے شعر کا فقدان نہیں ہو سکتا۔

ایک خاص خوبی دوسرا پہلو یہ ہے کہ بحور و قوافی کی پابندیاں اکثر جگہ خاص موسیقی سے بھری ہوئی ہیں۔ دنیا کی شاعری اس کے ارتقا کا استقرائی مطالعہ فرمائیے تو صاف ہو جائے گا کہ اکثر اوقات محض بحر کے طفیل سے زورِ بیان اور حسنِ ادا بہت بلند ہو گیا ہے۔

بعض جرمن ادبا کی رائے بعض جرمن ادبا نے اپنی تصانیف میں اس امر پر زور دیا ہے کہ اکثر اوقات ردیف، قافیہ اور بحر کی پابندی بنفس خود شاعرانہ تخیل و تصور کی محرک و معاون ہوتی ہے۔ اور صفائی و راستی کے علاوہ ایک خاص موسیقی۔ ایک دل آویز موہنی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کا اثر نہ صرف دماغ انسانی پر پڑتا ہے۔ بلکہ قلب یا روحِ انسان بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

وزن آپ نے خیال فرمایا ہوگا کہ میں نے وزن کا ذکر قافیہ، ردیف و بحر کے ساتھ نہیں کیا۔ اس لئے کہ وزن نہ صرف شعر کا جزو لاینفک ہے۔ بلکہ نظم کا بھی ہے۔ وزن اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ شعر کے اندر تناسبِ اصوات بن کر جلوہ گر ہو۔ اور نظم کے اندر تناسبِ خیالات کی حیثیت سے نور افشاں رہے۔

وزن کی حقیقت بہر طور اجزاء ترکیبی کا تناسب نہ صرف نظم و شعر کیلئے

ضروری ہے۔ بلکہ ہر ایسی چیز کے واسطے لازمی ہے جو حسین کہلائی جا سکے۔ مجھے افسوس ہے کہ شعر کے ارکان لازمی کے متعلق بحث کرتے ہوئے بعض یونانی، ایشیائی، اور یوروپین فلاسفہ نے بہت رواداری سے کام لیا ہے۔ ایک فرقہ محض وزن کو ضروری سمجھتا ہے۔ دوسرا محض تخئیل کو ضروری سمجھتا ہے۔

تخئیل و وزن دونوں ضروری ہیں

جو لوگ محض وزن کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے پاس اس امر کا کوئی جواب نہیں کہ معمولی سی بات جس کا میدان درحقیقت نثر ہو اگر تک بندی کر کے ردیف و قافیہ و بحر کی قید کے ساتھ سامنے لائی جائے تو آپ اس کو شعر کہیں گے یا نثر۔ مثلاً

میرا لوٹا مجھ کو دو　　اس کا پیسہ مجھ کو دو

اور اگر محض تخئیل شعر کے لئے ضروری ہے تو فلاطون کے مکالمے ارسطو کے قول کے مطابق سب کے سب شعر ہو جائیں گے۔ پورا قرآن شعر ہو جائے گا۔ حالانکہ خود قرآن اپنے شعر نہ ہونے کے متعلق صاف صاف کہتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کہیں بحر کے ٹکڑے آ جاتے ہیں۔

خیر ان دونوں باتوں کا تصفیہ تو نہایت آسان ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ شعر کے تخئیل و وزن دونوں ضروری ہیں۔ مگر ایک مشکل سب سے زیادہ یہ آن پڑتی ہے کہ ہم حقیقتاً وزن سے کیا مراد لیتے ہیں۔ اور ہمارے پاس اس امر کا ثبوت یا معیار ہے کہ فلاں بات وزن میں ہے۔ یا وزن سے خارج ہے۔ لفظوں میں یہ کہہ دینا کہ وزن اور تخئیل دونوں ایک دوسرے بغیر

مدغم رہتے ہیں۔ بہت آسان ہے، اگر بدیہی دلائل اور اصول مقرر کرنا بالکل دوسری چیز ہے۔

وزن کیا چیز ہے؟ مرتب اصوات کا ایسا مجموعہ ہے جو انسانی دل ودماغ پر اثر کرتا ہو۔ جس کے لئے دوسرا لفظ موسیقی ہے۔ کیا آپ نے کبھی خیال نہیں فرمایا کہ موسیقی کے لئے الفاظ ضروری نہیں ہیں۔ آپ نے اکثر زبانوں میں گانے سُنے ہوں گے جس کا ایک حرف بھی آپ کی سمجھ میں نہ آیا ہوگا۔ پھر بھی آپ محض آواز کے اُتار چڑھاؤ، تان، گٹکری، کَن، سَم، تال وغیرہ سے لطف اندوز ہوئے ہوں گے۔

وزن و تخیل کا اتحاد

اور اکثر یہ بھی ہوا ہو گا کہ کوئی عمدہ شعر بہت معمولی طور پر پڑھ دیا گیا ہو اور آپ نہایت درجہ متأثر ہوگئے ہوں۔ اگر یہ دونوں حالتیں آپ پر گذری ہیں تو آسانی سے سمجھ میں آئے گا کہ وزن تخیل شاعرانہ سے کوئی جُدا چیز نہیں ہے بلکہ اُسی کا ایک جزو ہے۔

پھر بھی دقت رہتی ہے کہ وزن اور انسانی فطرت میں کیا تعلق ہے۔ اگر ہم اس تعلق کو دریافت کرلیں تو گویا ہم کو ایک معیار مل جائے گا اور ہم فوراً بتا سکیں گے کہ فلاں بات شعر ہے یا نظم۔ صرف بتا دینا ہی نہیں، ثابت بھی کرسکیں گے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اتنے مہتم بالشان سوال کی طرف کسی نے پوری توجہ نہیں کی۔

اُردو کا علم عروض

اس سوال کو اور زیادہ مادی صورت میں لانے کے لئے

یوں ملاحظہ فرمائیے کہ اُردو کی شاعری میں فارسی سے اور فارسی میں عربی سے جو بحریں لی گئی ہیں اُن کی تعداد چودہ ہے۔ اور سب سے پہلے بحور کے ترتیب دینے والے ملا خلیل نے چودہ بحور اور اکیس زحافات قائم کر کے شعر کا معیار مقرر کر دیا ہے۔ اور انھیں کی بنا پر علم عروض میں صدہا کتابیں لکھی لکھ دی گئی ہیں لیکن بنگاہ غور سے دیکھیے تو تمام کمزوریاں صاف صاف ظاہر ہو جاتی ہیں۔

نقص

۱۔ چودہ بحور اور اکیس زحافات کے علاوہ اُردو کے اکثر شعرا مثلاً ولی نے، انشا نے، اکبر نے اور بعض دیگر شعرا نے خاص بحروں میں شعر لکھے ہیں۔ جو اُردو عروض کی مروّجہ بحور و زحافات میں تحلیل نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ شعر ہو سکتے ہیں تو ملا خلیل کی بنیاد پر لکھا ہوا عروض قطعی غلط ہے۔ اس لیے منطق کی رو سے کسی عالمگیر کلیہ میں کوئی استثنا ہو ہی نہیں سکتی۔ اور اگر آپ ان خاص بحور کو شعر نہ کہیں تو۔

مختلف زبانوں کی شاعری

۲۔ گویا آپ دنیا کی کسی اور زبان کی شاعری کو شاعری ہی تسلیم نہیں کرتے۔ اس لیے کہ انگریزی اور ہندی میں یا کسی زبان میں آپ کو صدہا ایسے شعر ملیں گے۔ جن کی تقطیع خلیل کے چودہ بحور اور اکیس زحافات میں نہیں ہو سکتی۔ بات یہ ہے کہ ملا خلیل نے معیار بناتے وقت محض عربی کے اُن قصائد کو اکٹھا کر دیا۔ جن کی بحریں مختلف تھیں۔ اور جن سے وہ بذات خود واقف تھے۔ اگر وزن اور فطرت انسانی کے علایق کی تحقیق کے بعد کوئی معیار

مقرر کیا جاتا تو وہ کسی خاص زبان کے لئے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لئے شعر کا معیار بن جاتا۔ لطف یہ ہے کہ ایسے معیار کے بغیر کسی زبان کا عروض مکمل عروض نہیں ہوسکتا۔ شاید آپ کو میرے اس بیان سے اختلاف ہو۔ ذرا غور فرمائیے۔ انگریزی اور ہندی کی نظمیں مصاریع، قوافی، ردیف اور بحور اردو فارسی یا عربی سے کس قدر مختلف ہیں۔

ہر زبان کا عروض غیر مکمل ہے

انگریزی میں ایک ہی نظم کے بعض مصرعے بڑے ہوتے ہیں۔ بعض چھوٹے۔ بعضوں کا قافیہ ایک مصرع کے بعد ہوتا ہے۔ بعض نظموں میں پہلا مصرع چوتھے سے یا پہلے بند کا دوسرا مصرع دوسرے بند کے ہم قافیہ ہوتا ہے۔ بہر طور کوئی زبان اس بات کا دعویٰ نہیں کرسکتی کہ دوسری زبانوں کی شاعری شاعری ہی نہیں۔ اور اُس کا عروض اصلی معیار ہے اور یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ بحور یا مصرع کے برابر ہونے یا قوافی و ردیف کی پابندیاں ضروری نہیں ہیں۔

صاحب طبع سلیم

بعض فلاسفہ حکما اور ادبا نے اس مسئلہ کو صرف یہ کہہ کر چھوڑ دیا ہے کہ صاحبِ طبع سلیم فطرتاً کسی چیز کو سُن کر سمجھ جاتا ہے کہ وہ شعر ہے یا نہیں۔ اس بیان کی صداقت میں ذرا بھی شبہہ نہیں۔ مگر ضرورت یہ ہے کہ جو لوگ صاحب طبع سلیم نہیں ہیں وہ بھی سمجھ سکیں کہ فلاں بات شعر ہے یا نہیں۔ اور اگر شعر ہے تو کیوں؟ جو لوگ صاحب طبع سلیم ہیں وہ محض سمجھ ہی نہ سکیں بلکہ سمجھا بھی

نہ سکیں ۔ ورنہ معیار اور کلیہ حقیقی معنوں میں کسوٹی اور اصول نہ بن سکیگا۔

مختلف ترتیب اصوات

بہرکیف یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ بعض ترتیب اصوات انسانی تاثیرات و جذبات پر موثر ہوتی ہیں۔ بعض موثر نہیں ہوتیں۔ جو موسیقی یا وزن انسانی فطرت کے کسی جذبہ یا شعور کو متاثر کرسکتا ہے (خواہ وہ حواس خمسہ سے متعلق ہو یا غم و مسرت، نفرت و محبت سے متعلق ہو یا ارادہ اور تمیزہ سے دست و گریباں ہو) اس میں اور فطرت انسانی میں کوئی خاص لگاؤ ضرور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الفاظ میں ادا کی ہوئی موسیقی اور موسیقی میں ادا کی ہوئی نظم بھی ہمارے دل و دماغ پر غیر مکمل طور سے سہی اثر ضرور کرتی ہے۔

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم فطرت انسانی اور موسیقی کے تمام علایق کو دریافت کرکے یہ پتا لگائیں کہ مد و قصر آواز کی کتنی قسمیں انسانی فطرت میں آئیں گی۔ اس طور پر ہم کو کچھ اصول اور کلیے حاصل ہو جائیں گے۔ اس لئے فطرت انسانی خصائص و اعراض میں نہ سہی، اجزاء لازمی میں مشترک و یکساں ہے۔ اور اس معیار کی وجہ سے ہم دنیا کے کسی شعر اور کسی وزن کو اپنے مقرر اصول میں تحلیل کرسکیں گے۔

منطق کا فائدہ

دریافت اصول میں ہمارے واسطے سب سے زیادہ کارآمد شے منطق ہوگی۔ سب سے پہلے ہم دنیا کے قریب قریب ہر حصے کی نظم و موسیقی کا مطالعہ کرکے جو ترتیب اصوات بہت سی بحور میں یکساں ہیں۔ اُن کو ایک جگہ جمع کرلیں گے۔ تمام مختلف

زبانوں میں جوہر مشترک کا پتہ لگائیں گے۔ اس طور سے جو اصول مقرر ہوں گے اُن کے معیار پر مختلف زبانوں کے مختلف اصناف و نظم و شعر کو جانچ کر اُن اصول کو مکمل بنالیں گے۔

اس معیار کا حال بالکل وہی ہوگا جو منطق کے اور کلیوں کا ہے مثلاً ہم کہتے ہیں کہ زید یا عمرو یا بکر فانی ہے۔ اس بیان میں نہ تو یورپ کے کسی آدمی کو شک ہوسکتا ہے نہ ایشیا یا امریکہ یا دنیا کے کسی شخص کو شبہہ پیدا ہوسکتا ہے۔ مگر ہر شخص کو یہ پوچھنے کا مجاز ہے کہ زید یا عمرو یا بکر فانی کیوں ہے۔ آپ کے پاس اس کا ثبوت کیا ہے۔ ہم دلیل کے واسطے اسی بات کو یوں کہیں گے۔

انسان فانی ہے

زید انسان ہے

لہٰذا زید بھی فانی ہے

اب اس کے بعد یہ سوال رہ جاتا ہے کہ آپ نے یہ کس طرح فرض کرلیا کہ انسان فانی ہے۔

استقرار اب ہم بتائیں گے کہ دنیا کے اکثر تجربات، مشاہدات، معلومات کی مدد سے ہم نے معلوم کرلیا کہ فلاں مرگیا اور فلاں فنا ہوگیا۔ خود اپنی آنکھوں سے بچے، بوڑھے، جوان مرد عورت، لڑکے لڑکی کو، (لڑکے کسی قوم و قبیلہ کے ہوں) مرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اور اسی سے استقرار کرتے ہیں کہ فطرتِ انسانی میں فنا کا جوہر موجود ہے۔ یعنی جو چیز

ذی حیات ہوگی اس کے لئے فنا لازم ہے۔

کانفرنس کی ضرورت

یہ ایسا عالمگیر کلیہ ل جاتا ہے کہ کسی کو شبہہ نہیں رہ جاتا۔ اسی طور پر اگر دنیا کے ہر ملک سے ادبا اور موسیقی داں ایک کانفرنس میں بیٹھ کر فطرت انسانی اور وزن کے علائق کو دریافت کرلیں تو شعر کا معیار بھی مقرر ہو جائے گا۔

طریقۂ کار

اب سوال یہ ہے کہ ایک جگہ سب کیسے جمع ہوں گے؟ یا جمع بھی ہوئے تو تبادلۂ خیالات کس طور پر کرسکیں گے؟

آج کلہ دنیا کے کسی ایک مقام پر ہر زبان کے نمایندوں کا جمع ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ ریل، موٹر اور ہوائی جہاز سے جو سہولتیں پیدا ہوگئی ہیں اُن سے ایک عالم واقف ہے۔ یہ دقت ضرور ہے کہ ہر شخص دنیا کی تمام زبانوں کا ماہر نہیں ہو سکتا۔ آج تک تاریخ عالم میں تو کوئی مثال ایسی نہیں ملی۔ مگر یہ آسان ہے کہ ہر باکمال ادیب اپنی مادری زبان میں ملکہ رکھتا ہو اور کسی ایک دوسری زبان میں بھی اظہار خیالات کرسکتا ہو۔ اس اندازے سے اگر دنیا والے ایک زبان کو مشترک کرلیں اور اپنی اپنی زبان کی نظم و موسیقی کو یکجا کریں تو اتنا مشکل کام نہایت آسان ہو جائیگا۔

سیاسی فوائد

مجھے اُمید ہے کہ فلاسفہ، ادبا اور موسیقی داں حضرات اس طرف ضرور توجہ فرمائیں گے۔ اور تمام دنیا کی ایک ادبی کانفرنس قائم کرلیں گے۔ ایسی کانفرنس تمام عالم کے ادب و زبان کے لئے تو معجزہ کی حیثیت رکھے ہی گی مگر اس سے قطع نظر، بین الاقوامی

محبت و رواداری اور تمدن و معاشرت کی اعانت و اصلاح کے لیے بہترین صورت ہوگی۔ خدا کرتا میری یہ صدا " صدا بہ صحرا" یا "بازگشت" ہو کر نہ رہ جاتی۔

نثر منظوم اور نظم کا فرق

نثر منظوم ایسی نثر ہے جو مقفّٰے و مسجّع اور نازک معانی و مفاہیم کا خزانہ ہو۔ مگر صفحات گذشتہ سے صاف ظاہر ہو گیا ہو گا کہ نثر و نظم ایک چیز نہیں ہو سکتے۔ یہ مسئلہ اپنی پیچیدگی اور دقّت کی وجہ سے نہایت طلسمی حیثیت رکھتا ہے۔ اکثر ناقدین نے تخیلی نقطۂ نگاہ سے نثر منظوم اور نظم اصلی میں کوئی فرق نہیں کیا۔ مگر تفصیلی بحث سے قطع نظر موزونیت موضوع اور مناسبت بحث دو ایسے زبردست عناصر ممیّزہ ہیں جو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیتے ہیں۔

جذبات کی موزونیت

عقل سلیم بتاتی ہے کہ بعض جذبات، مدرکات اور اثرات ایسے ہیں جن کے لیے صرف شعر مناسب ہوتا ہے۔ اور بعض واقعات و خیالات سانحات و معلومات ایسے ہوتے ہیں جن کے بیان کے لیے نثر ہی موزوں ہے۔ یہ فطری تعلیم عارضی یا رسمی نہیں ہے۔ بلکہ اصلیت و صحت سے مالا مال ہے۔

ہر چیز کا میدان مخصوص ہے

اگر آپ دلیل چاہتے ہیں اور بذات خود اپنی عینی و یقینی تشفی کرنا چاہتے ہیں تو انیس، میر، غالب یا کسی اور

کامل شاعر کے شعر کو نثر کا جامہ پہنائیے۔ الفاظ بھی قریب قریب وہی ہونگے مطالب بھی وہی رہے گا۔ مگر وہ تاثیر جاتی رہے گی۔ بے لطفی اور خشکی کا دور دورہ ہو جائے گا۔ یہ صرف اس لئے نہیں کہ ایک میں وزن ہے دوسرے میں وزن نہیں بلکہ اس واسطے کہ بعض مطالب کے ادا کرنے کے لئے نظم مخصوص ہے۔ اور بعینہ یہی حالت پیش آئے گی۔ اگر آپ آزاد، فوق یا سرسید کے کسی ایک فقرہ کو نظم میں منتقل فرمائیں۔ وزن ہوگا، موسیقی پیدا ہو جائے گی۔ بحر و قافیہ و ردیف سے بات سج جائے گی مگر پھیکے اور بے مزہ شعر سے کوئی کیفیت حاصل نہ ہوگی۔ محض اس واسطے کہ اس خیال کے ادا کرنے کے لئے نثر کا میدان مخصوص تھا۔

آمد و آورد

ادب اردو میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جن کا مفہوم عام طور پر کچھ سمجھا جاتا ہے۔ اور حقیقتاً اصلی مفہوم کچھ اور ہوتا ہے۔ آمد و آورد بھی انھیں لفظوں میں سے ہیں۔

بعض آراء

شبلی و حالی نے آمد و آورد کا فرق بہت معقول طریقہ سے دکھایا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ پوری بے تعصبی سے کام نہیں لیا گیا۔ حالی کا یہ کہنا بہت درست ہے کہ جو بات غور و فکر، قطع و برید، اور گہرے مطالعہ اور مشاہدہ کے بعد لکھی جائے گی اس کا اثر بہت زیادہ ہوگا۔ مگر ان کا یہ فرمانا انصاف کے خلاف ہے کہ دنیا کے بہترین

ادب میں ایسے کلام کا فقدان ہے۔ جس میں آمد کا پہلو غالب ہو۔

آمد و آورد کے فرق کے لئے صرف اتنا ہی سمجھ لینا کافی ہے کہ آمد کے معنی ہیں آیا۔ آپ سے آپ آیا اور آورد کے معنی ہیں لایا گیا یعنی کوئی دوسرا تلاش و کوشش سے لایا۔

میری رائے | میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آمد و آورد ایک ہی زنجیر کی دو کڑیاں ہیں۔ یا یوں سمجھ لیجئے کہ ارتقائے خیال کے دو درجے ہیں۔ آورد پہلا درجہ ہے اور آمد دوسرا درجہ ہے۔ ان دونوں درجوں میں باہم بہت تعلق ہے۔ فکر نظم کو آورد سمجھ لیجئے اور سلیقۂ شعر گوئی کو آمد خیال فرمائیے۔ تو تمام دقتیں نقش بر آب معلوم ہوتی ہیں۔ آمد کی خصوصیات میں سنجیدگی اور وزن تخیلی ہے۔ وہی چیز جو نو مشق شاعر کو بے انتہا فکر و غور کے بعد غیر مکمل طور پر حاصل ہوتی ہے۔ ایک باکمال شاعر کا دماغ اسی شے کو بلکہ اکثر اوقات اس سے بہتر شے کو فوراً برجستہ یا ذرا سی فکر کے بعد پا لیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جو شان ایک مبتدی بہت زیادہ جانفشانی کے بعد اپنے شعر میں پیدا کرتا ہے۔ وہ ایک کہنہ مشق شاعر صرف ایک دو لفظوں میں بلا تکلف پیدا کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باکمال حضرات کے شعر میں آورد و آمد دونوں ایک ساتھ پائے جاتے ہیں۔ تخیل بھی سنجیدہ و گراں قدر ہوتی ہے اور طرزِ بیان میں دل کشی و بے ساختگی بھی ہوتی ہے۔

نظم و سائینس

کلام وحیاتِ شاعر حیاتِ انسانی جذبات و محسوسات کا گنجینہ ہے اور شاعری اُن کے اظہار و بیان کا ذریعہ ہے۔ شاعر کے خیالات بلکہ مکمل حیات کا سُراغ اُس کے اشعار سے ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلامِ شاعر، حیاتِ شاعر کا ایک مکمل صحیفہ مانا گیا ہے۔ دنیائے شعر میں عالمِ موجودات کی ہر شے اپنے حسن و دل کشی اثر و جمال کے تناسب سے حصہ رکھتی ہے۔

سائنس اور نظم کا اتحاد سائنس موجودات کی واقفیت و ماہیت، اسباب و عِلَل، اثرات و نتائج، علائق باہمی، اجزائے ترکیبی اور امتیازات مخصوصہ سے بحث کرتی ہے مگر شاعری جرّاحیِ اعضاء اور تحلیل اجزاء سے قطع نظر صرف ان اثرات، مسرت و عجب، عزت و نفرت، صلابت و ہیبت، حسن و خوبی کا گلدستہ ہوتی ہے جو اشیاء خارجی اور فکر شعری اس کے دماغ میں پیدا کرتے ہیں۔ اسی لئے عالمِ شاعری ممالک، تصورات اور دوِل خیالات کا احاطہ ہوا کرتا ہے جہاں خارجی اشیاء بہ حیثیتِ اشیاء کوئی اثر نہیں ڈالتیں بلکہ محض اُن کی خوبی اور دل کشی سے جو جذبات پیدا ہوتے ہیں وہی قابلِ قبول بن جاتے ہیں۔

سائنس اور پھول مثال کے طور پر گلاب کے پھول کو لے لیجئے۔ سائنس کا شیدائی، جس نظر سے اس پھول کو

دیکھے گا۔ اس کی ایک معمولی سی تفصیل یوں ہو سکتی ہے۔

نسل	۱۔ اس پھول کی نسل کیا ہے؟
طبقہ	۲۔ یہ پھول رنگ و بو کے اعتبار سے کس طبقہ سے تعلق رکھتا ہے؟
اجزاء	۳۔ اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟
ماہیت اجزاء	۴۔ ان اجزاء کی ماہیت اور ان کا باہمی تعلق کیا ہے؟
انفرادی حیثیت	۵۔ ہر جزو کا اثر انفرادی حیثیت سے کیا ہے؟
مجموعی حیثیت	۶۔ پورے پھول کے اثرات مجموعی حیثیت سے کس قدر ہیں؟
مشابہت	۷۔ اور پھولوں کے ساتھ اس کی مشابہت کتنی ہے؟ کتنی خوبیاں مشترک ہیں۔
مغائرت	۸۔ اور پھولوں سے اس کی مغائرت کتنی ہے؟ مختلف خوبیاں کتنی ہیں؟
اسبابِ ماحول	۹۔ اُن کے رنگ و بو کی ماہیت اصلیت اور اس کے اسباب ماحول و فضا کے اثرات کیا ہیں؟
شاعر اور پھول	مگر شاعر کو ان سب چیزوں سے کوئی علاقہ نہ ہوگا۔ وہ آپ کو بتائے گا کہ
مہک	۱۔ اس کی مہک کس قدر دل آویز ہے؟
سکون یا اضطراب	۲۔ اس کی بھینی بھینی خوشبو سے سکون یا اضطراب

پیدا ہوتا ہے ؟

سیر	۳۔ اُس کی سیر سے جی بہلتا ہے یا طبیعت میں وحشت پیدا ہوتی ہے ؟
رنگ	۴۔ اُس کا رنگ نگاہوں میں کھپا جاتا ہے یا نگاہوں پر بار ہے
لطافت	۵۔ اُس کی پنکھڑیوں میں کیسی لطافت و نزاکت ہے ؟
تازگی	۶۔ تازگی سے کیا کیا باتیں یاد آتی ہیں ؟ ۔
باغبان فطرت	۷۔ اُس کا تعلق باغبان فطرت سے کس قدر ہے ؟
معرفت	۸۔ صحیفۂ معرفت اور اُس کی پنکھڑیوں میں کیا علائق ہیں ؟
جلوہ	۹۔ انسان کی مستی و بے خودی اور اُس کے جلوہ میں کیا رشتہ ہے ؟

جہاں اس مثال سے سائنس اور شاعری کا فرق معلوم ہوتا ہے وہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ باکمال شاعر سائنس سے حسب ضرورت کام لے سکتا ہے اور اس کی خشکی و بے لطفی کو چاشنی و حلاوت سے بدل سکتا ہے ۔

نشست الفاظ

ترتیب اور موسیقی	شعر کے لیے نشست الفاظ نہایت ضروری ہے۔

ابن خلدون نے تو اس بارے میں تو یہاں تک مبالغہ کیا ہے کہ اُس کے نزدیک شعر کے لئے معنے کے مقابلہ میں الفاظ

کی وقعت زیادہ ہے۔ حالانکہ صاف ظاہر ہے کہ الفاظ کا وجود بھی صرف معنے ہی سے ہے ورنہ موضوع اور مہمل میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ بہرطور لفظوں کی ترکیب ہی سے وزن یا موسیقی پیدا ہوتی ہے جو شعر کی روح رواں ہے اور جس کے بغیر دلکشی و تاثیر ہو ہی نہیں سکتی۔

یہی وجہ ہے کہ کسی اچھے شعر کی نثر میں (خواہ کتنی ہی کم تبدیلیوں کے ساتھ کی جائے) وہ لطف دل کشی اور جادوئے تاثیر باقی نہیں رہتا۔ جو اصل شعر کے پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً

اُلٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے — مگر اس کو فریب نرگس مستانہ آتا ہے

ضرورت — اس کی نثر فرمائیے تو کم و بیش اس طور پر ہوگی۔ پیمانہ جب گردش میں آتا ہے (تو) صفیں اُلٹتی ہیں (شاید۔ غالباً۔ یقیناً) اُس کو نرگس مستانہ کا فریب آتا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے الفاظ قریب وہی ہیں صرف جگہ بدل جانے سے آسمان و زمین کا فرق ہو گیا ہے اس لئے کہ

دو مثالیں — ۱۔ شبنم کے چمکتے ہوئے موتی سبزہ کی نرم مخمل پر بکھرے اور نہاتے رہتے ہیں۔ لیکن جگہ بدل دیجئے۔ کسی دست سیمیں میں دے دیجیے تو اصل باقی رہے گی مگر نہ تو چمک رہ جائے گی نہ دمک۔ ہر موتی پانی پانی اور پسینہ پسینہ ہو جائے گا۔

۲۔ چند دیدہ زیب جواہر رکھے ہوئے ہیں جن میں ہر فرد بہ حیثیت انفرادی دل نواز ہے۔ اب ایک باکمال جوہری اُن کے سنگ و رنگ قدو

لور کے تناسب و توازن کا اندازہ کرکے ایک خاص ترکیب کے ساتھ ہار میں پرو دیتا ہے۔ اس ترکیب سے ایک خاص قسم کا جادو پیدا ہو جاتا ہے جو تمام جواہر کے انفرادی چمک دمک سے جُداگانہ ہوتا ہے۔ یہی حال اس شعر کا ہے جس کی نشست الفاظ بہترین الفاظ سے ہوئی ہے۔

اُردو کی شاعری کی قسمیں

معیار تقسیم | ذیل کی تقسیم نہ تو صوری و معنوی خوبیوں پر مبنی ہے نہ منطقی نہ عروضی بنیاد پر ہے اور نہ رسمی اعتبار سے کی گئی ہے بلکہ جن چیزوں سے ادیب بہ نفس خود بہت زیادہ تعلق رکھتا ہے انکو ہم نے داخلی قرار دیا ہے۔ اور جن میں شاعر اپنے جذبات و محسوسات سے زیادہ خارجی اشیاء کی مصوری و نقاشی سے غرض رکھتا ہے۔ انکو خارجی قرار دیا ہے۔

ذیل کے چند سطور میں اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ ہر ایک کے ضروری محاسن و معائب اور مقاصد و اغراض بیان کر دیے جائیں۔

داخلی امتیاز سے اُردو شاعری کی تقسیم اس طور پر ہو سکتی ہے۔

غزل | ۱۔ غزل۔ اردو کے غزل گوئی کی ابتدا فارسی کے تتبع اور تقلید سے ضرور ہوئی مگر رفتہ رفتہ اُردو کی غزل نے اپنا میدان بہت وسیع کر لیا۔ اور غزل گوئی سے تقلیدی شان رخصت ہوگئی۔ غزل کے لغوی معنے عورتوں سے بات چیت کرنے کے ہیں۔

حقیقت

اس سے یہ مراد نہیں کہ عورت مرد سے دو بدو گفتگو ہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسی نرم و لطیف باتیں ہوں جو عورتوں سے کی جاسکیں۔ ایشیا میں عورت کا درجہ تمدنی، علمی، معاشرتی یا دیگر حیثیات سے ابھی تک اتنا بلند نہیں ہوا جتنا یورپ کے بعض حصص میں ہوچکا ہے۔ لہٰذا اردو غزل کے خیالات بھی زیادہ تر سادگی، بے تکلفی، عام فہم جذبات یا حسن و عشق کی لطیف طعن و تشنیع یا کعبہ و بتخانہ، شراب و عرفان کی تصویر پر مشتمل ہے۔

بعض غزل گو

یہ سچ ہے کہ اکثر شعرا نے صنائع و بدائع کے کثرت استعمال اور تراکیب و اضافات کی زیادتیوں سے غزلوں کو بہت زیادہ دقیق، یا مبالغہ آمیز بنادیا ہے۔ مگر ایسے لوگ زیادہ نہیں ہیں۔ سودا، شاہ نصیر، منیر یا ان کے تلامذہ اس میدان میں سب سے آگے نظر آتے ہیں۔

عرب اور غزل

عرب میں شاعر اپنے معشوقوں کے نام نہایت آزادی سے لیا کرتے تھے۔ اور تخاطب بھی اکثر اصلی نام سے ہوا کرتا تھا۔ جب زمانہ نے پلٹا کھایا تو فارسی والوں نے ذرا تہذیب برتی اور فرہاد و شیریں مجنوں و لیلیٰ کو عشق و حسن کے زندہ پیکر مان کر اصلی عاشق و معشوق کے جذبات انھیں کے پردے میں ادا کرنے لگے اور کم و بیش اردو غزل گوئی میں ابھی تک یہی طریقہ رائج ہے۔

اعتراض

بعض تنگ نظر حضرات اعتراض کرتے ہیں کہ اردو شاعری

امرد معشوق | کا معشوق امرد ہوتا ہے۔ لہذا وہ جذبات جو عورت کے عشق میں پیدا ہوتے ہیں اُردو غزل سے مفقود ہیں۔

ردّ اعتراض | ۱۔ میں ایسے حضرات سے نہایت ادب سے عرض کرونگا کہ اُردو غزلوں کا مطالعہ ذرا محنت اور بے تعصبی کے ساتھ فرمائیں۔ اُردو غزل گوئی کے ہر دور میں ایسی مثالیں کثرت سے موجود ہیں جہاں عورتوں کے مخصوص ساز و سامان، لباس و آرائش کا ذکر کھلے بندوں کیا گیا ہے۔

دلائل | ۲۔ کیا ہم آپ خود بعض اوقات تہذیب کے تقاضا سے مجبور ہوکر عورت کے لیے بھی مردانہ صیغے استعمال نہیں کرتے۔ اگر اُردو کے غیور اور باکمال شعراء نے بھی اس کا لحاظ رکھا تو کیا گناہ کیا؟

غلوئے نفس | ۳۔ یہ سچ ہے کہ تشبیہوں کی نزاکت اور صنائع کی تلاش میں بعض غزل گو حضرات نے سبزۂ خط، طفلِ عطار یا قبا و دستار کا ذکر کر دیا ہے۔ مگر اس کی حیثیت بھی معنوی اعتبار سے بالکل بدل جاتی ہے۔ اس لیے کہ شاعر کے معنی اکثر اوقات اُس کے الفاظ سے کہیں زیادہ گراں قدر و وقیع اور رفیع ہوتے ہیں اور با کمال شاعر کسی دنیوی محبوب کا ذکر کرتے ہوئے خالق مخلوق کا خیال ہمیشہ مد نظر رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مفہوم شعر کے مجازی درجہ سے حقیقی درجہ تک پہنچنے میں بہت کم تکلف ہوتا ہے۔

دوسرا اعتراض | دوسرا اعتراض جو غزل پر کیا جاتا ہے کہ اس میں

حسن و عشق کے پارینہ افسانے اور گل و بلبل کی کہانیوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

ردّ اعتراض ا۔ یہ اعتراض بھی تعصب و جہالت پر مبنی ہے۔ اُردو شاعری میں غزلوں کے دواوین کا جس قدر ذخیرہ موجود ہے۔ اتنا کسی اور صنف میں نہیں ہے۔ اگر انصاف سے اساتذہ کے دواوین کی سیر فرمائیے تو حمد و منقبت معرفت و توحید، جذباتِ حُب الوطنی و مسرت، و غم، و تصوّف کے مسئلے، حیات انسانی کے اہم ترین نکات، و دیگر عالمانہ فلسفیانہ، مدنی و معاشرتی خیالات کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔ مناظر فطرت کی مصوّری اور حیات لطیف کی نقاشی بھی معتد بہ حصہ میں موجود ہے۔ مثلاً

بعض مثالیں "درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا" یا "ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں" یا

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
بہت صدمہ ہے اس قطرہ کو دریا کی جُدائی کا۔ یا

جلوہ ترا بہت ہے زمانے کے واسطے"
ایک شمع بس ہے آئینہ خانے کے واسطے

دل تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار ہم کو کوئی ستائے کیوں (۱)

اسی طرح ہزارہا شعر گنائے جا سکتے ہیں۔ اگر کوئی نہ دیکھے تو

"چشمۂ آفتاب را چہ گناہ"؟

لفظ و معنی کا فرق

۲- دوسرے یہ کہ معترض حضرات صرف سطحی مفہوم اور لفظوں کے ظاہری معنے پر نگاہ رکھتے ہیں۔ معنوی خوبیوں کو ذرا بھی دھیان میں نہیں لاتے۔ اکثر اوقات قادر سخن غزل گو گل و بلبل کے افسانوں اور حسن و عشق کی کہانیوں میں ایسے دلچسپ اور معنی خیز سبق دے جاتا ہے جس کی تشریح کے لئے نثر میں دفتر کے دفتر ناکافی ہوتے ہیں۔

خصوصیت

غزل کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے اور وہ آخری شعر جس میں شاعر کا تخلص ہوتا ہے مقطع سمجھا جاتا ہے۔ اگر ایک سے زیادہ مطلعے ہوئے تو دوسرا تیسرا چوتھا ہر مطلع حسن مطلع کہا جاتا ہے۔ غزل میں رواج ہے کہ طاق اشعار ہوں۔ بعض غزل گو شعراء ایک ہی زمین میں، دو غزلہ سہ غزلہ کہتے ہیں۔ تعداد اشعار کی کوئی قید نہیں مگر رواجاً اکیس ۲۱ شعر سے زائد کی غزل بہت کم ہوتی ہے۔ بعض اردو کے شعراء نے غزل میں مسلسل مضامین باندھے ہیں۔ ورنہ رواجاً غزل کا ہر شعر بہ حیثیت خود مکمل آزاد اور تمام دیگر اشعار غزل سے معنوں میں مختلف ہوتا ہے۔ اگر کوئی مضمون ایک سے زیادہ اشعار میں ادا ہوتا ہے تو ان اشعار کا مجموعہ قطعہ کہلاتا ہے۔

اشکال

غزل گوئی کو لوگ عام طور پہ آسان سمجھتے ہیں مگر میرے نزدیک مشکل ترین صنعت شاعری یہی ہے۔ دریا کو کوزہ میں بند کرنا

اسی کا نام ہے کہ ایک مکمل مضمون کو قافیہ و ردیف کی پابندی کے ساتھ ندرت و جدت سے ایک شعر میں ادا کر دیا جائے۔

غزل اور Lyric | غزل کو بعض لوگ انگریزی کے لیرک Lyric سے مثال دیتے ہیں۔ مگر حقیقتاً غزل لیرک سے زیادہ مختصر اور کہیں زیادہ وسیع ہے مختصر اس لئے کہ جو مضمون لیرک کے بہت سے اشعار میں ادا ہوتا ہے۔ وہ غزل کے صرف دو مصرعوں میں بھر دیا جاتا ہے اور وسیع اس لئے کہ ہر شعر میں مختلف اور جدید بات ہوتی ہے اور لیرک میں صرف ایک ہی موضوع مد نظر رہتا ہے۔

کاش غزل میں بھی مسلسل مضامین باندھنے کا رواج عام ہو جاتا تو غزل یقیناً لیرک سے مشابہ و مماثل ہو جاتی۔

موجودہ دور کے بعض غزل گو | اردو کی خوش نصیبی سے حضرات اکبر اور اقبال جگر اور آثر، نظر اور اصغر نے غزل کے دائرہ کو عملاً بہت وسیع کر کے ثابت کر دیا ہے کہ اس میں ہر قسم کے خیالات بلا تکلف ادا کئے جا سکتے ہیں۔ مگر میں تشنہ کامان تحقیق سے یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ مواضیع و مباحث کے لحاظ سے اردو غزل کے خیالات کبھی محدود نہ تھے۔ کچھ تو تقاضائے رنگ زمانہ اور کچھ ہمسازی مذاق زمانہ کی وجہ سے اردو کے شعرا نے غزل کا پیرایہ تقلیدی حیثیت سے رکھا۔

غزل کی شان | جو شاعر علم و فضل کے اعتبار سے وسیع النظر گذرا ہے۔ اس نے نہایت آزادی سے کام لیا ہے۔ میرے نزدیک غزل کی خصوصیات میں

یہ داخل نہیں کہ صرف چند پامال خیال تک محدود رہے۔ ہاں غزل کی شان یہ ضرور ہونی چاہیے کہ زبان صاف ستھری، خیالات جلد سمجھ میں آجانے والے اور الفاظ موسیقی و تاثیر سے بھرے ہوئے ہوں۔ ان خوبیوں کے ساتھ آپ غزل کو جس قدر وسعت دے سکیں گے ادب اردو پر اسی قدر احسان ہوگا۔

افسوس ہے کہ دور حاضرہ کے اکثر شعرا سہولت بیان یا دلکشی یا سادگی کا لحاظ اپنے کلام میں زیادہ نہیں رکھتے۔ اگر وقت نے ساتھ دیا تو غزل کے ارتقا پر ایک تفصیلی مضمون لکھنے کا ارادہ ہے۔ اسی سلسلہ میں آج کل کے بعض صاحب دیوان حضرات کے کلام کا نمونہ بھی پیش کیا جائے گا۔

غزل کا درجہ | بہر طور اردو شاعری کے اصناف میں غزل کا درجہ، صوری و معنوی حیثیات سے بہت بلند ہے اور اس کی قبولیت و تاثیر کا عجب عالم ہے۔ تقریبوں میں، جلسوں میں، مشاعروں میں، صحبتوں میں ہر جگہ اسی کے چرچے ہوتے رہتے ہیں۔ اسی کے اشعار عام طور پر سنے جاتے ہیں اور یاد رہتے ہیں۔ ادب اردو کی خدمت نشر کے لیے صحیح معنوں میں غزلگوئی نہایت چلتا ہوا جادو ہے۔

تصویر کا تاریک رُخ | اسی سلسلہ میں ایک امر کی طرف اور توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ بعض شعرا نے رذیل، عامیانہ، بازاری یا سوقیانہ الفاظ و محاورات و خیالات لکھے ہیں ان سے قطع نظر مستند شعرا کے یہاں بھی یہ طریقہ عام رہا ہے کہ ناکردہ گناہ واعظ، زاہد، ناصح اور محتسب سے بیجا چھیڑ چھاڑ کی گئی ہے۔ حضرت یوسفؑ کے دامن کی دھجیاں اڑائی گئی ہیں۔ زلیخا کے ننگ و حیا پر حملے کیے

گئے ہیں۔ عیسیٰؑ کے اعجاز کا بیان عجیب عجیب طور پہ ہوا ہے، موسیٰ کے غش کھانے کو تنگ ظرفی، کمزوری، کم ظرفی سے تعبیر کیا گیا ہے، خضر کو راستہ بتایا گیا ہے۔ بہشت، حور، فرشتے اور کعبہ کے متعلق خدا جانے کیا کچھ کہا گیا ہے۔

ترک اولےٰ

ہر چیز کی مناسبت زمانہ کے ساتھ ہوتی ہے اور ہر چیز کے لیے ایک زمانہ ہوا کرتا ہے۔ دور حاضرہ کی متانت اور تمدن اس بات کا متقضی ہے کہ اس قسم کے غیر متین خیالات سے پرہیز کیا جائے۔ شوخیٔ طبع دکھانے کے لیے اور بہت سے میدان ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اُن کے ترک کر دینے سے کسی قسم کی کوئی کمی کوئی نقص یا کوئی زیان نہیں ہوتا۔

ہمیں مسرت ہے کہ دور حاضرہ کے بعض شعرائے خاص طور پر توجہ فرمائی ہے اور رفتہ رفتہ اس قسم کے تخاطب سے کنارہ کرتے چلے ہیں۔

مصارع کے مجموعے

۲۔ بیت، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مسبع وغیرہ محض مصرعوں کی تعداد کی بنا پر مختلف نام رکھ دئے گئے ہیں۔ ان میں کوئی بات فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے تشریح کی محتاج نہیں ہے۔ کبھی تیسرا کبھی چوتھا کبھی آٹھواں مصرعہ بار بار آتا ہے یا ہم قافیہ ہوتا ہے۔

لوگ اکثر اوقات دوسروں کے اشعار پر تضمین کر کے یا مصرعہ لگا کے یا گرہ لگا کے مثلث، مربع، یا مسدس کر لیا کرتے ہیں۔

مستزاد

۳۔ مستزاد۔ مستزاد اور غزل میں صرف فرق یہ ہے کہ اس میں ہر مصرع کے بعد دو یا ایک رکن بحر سے الگ ہوتے ہیں۔ اور زیادہ تر اثرات رنج و غم کے تسلسل کے لیے قدمانے یہ صنف اختیار کی تھی۔ اب اسکا رواج رفتہ رفتہ اٹھتا جاتا ہے۔

واسوخت | ۴۔ واسوخت۔ یہ مسدس یا ترجیع بند کی ایک مخصوص شاخ ہے جس میں معشوق کے جور و ظلم کی شکایات، اپنے خلوص و وفا کی حکایات اور اس بات کی دعا یا بددعا دی جاتی ہے کہ خود معشوق بھی کسی دوسرے پر عاشق ہو اور اس کا معشوق بھی اس کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرے۔ واسوخت لکھنے والوں میں امانت نے قابلِ رشک کامیابی حاصل کی ہے مگر یہ صنف بھی اب متروکات میں داخل ہوتی جاتی ہے۔

رباعی | ۵۔ رباعی۔ اس کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے اور چوتھا مصرعہ مقفّٰی ہوتے ہیں۔ اس میں مذمتِ دنیا، نشیب و شباب کی کیفیات، حمد و نعت کے نکات، تصوف کے مسئلے، یا واقعاتِ کربلا کے مناظر کھینچے جاتے ہیں۔

حسن و قبول | یہ صنف اپنے اختصار و جامعیت کے لحاظ سے نہایت مقبول و دلکش ہے۔ قریب قریب ہر دور کے شعرا نے اس کی طرف توجہ کی ہے مگر انہیں کو جو رتبہ رباعیوں کی دنیا میں نصیب ہوا ہے وہ شاید ہی کسی دوسرے کو ملا ہو۔ وہ اگر عمر خیام فارسی کے مشہور رباعی گو سے بڑھے نہیں تو کم بھی نہیں رہے۔ عشق، تعشق، دبیر، اوج، نفیس، رشید، عارف سب کے یہاں رباعیاں موجود ہیں۔ مگر انیس کی شان اور ہی کچھ ہے۔

یہاں تک داخلی اعتبار سے اصنافِ شاعری کا ذکر تھا۔ اب خارجی اعتبار سے ملاحظہ ہو۔

سلام و نوحہ | ۱۔ سلام و نوحہ۔ ان کا حال بھی غزل و مستزاد سے بہت ملتا جلتا ہے فرق یہ ہے سلام و نوحہ کے لئے مضامین مخصوص ہوا کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ سلام میں

حمد و نعت، بے اعتباری دنیا، تعلّی زیبا، اخلاق، شوقِ زیارت وغیرہ کے مضامین بھی نظم ہوتے ہیں۔ جو ایک حد تک داخلی شان کے حامل ہیں۔ مگر زیادہ تر اعتقادیہ اشعار یا واقعات کربلا کی تصویر کشی ہوتی ہے۔

مثنوی | مثنوی۔ اس کا ذخیرہ بھی اُردو میں کافی موجود ہے۔ ادب کے دورِ اوّلین سے آج تک مثنویاں لکھی جاتی ہیں۔ اشعار کے کوئی قید نہیں۔ بحر ایک ہوتی ہے۔ مگر ہر شعر کے ردیف و قافیے جُداگانہ ہوتے ہیں۔ مسلسل اور وسیع مضامین کے ادا کرنے کے لئے مثنوی بہترین ذریعہ ہے۔ خاص طور پر قابل ذکر من لگن، نل دمن، سحر البیان، ہشت گلزار، شوقؔ قدوائی، داغؔ اور نسیم والی مثنوی ہے۔ مثنوی کا رنگ اب تک یہی رہا ہے کہ حمد و نعت و منقبت کے بعد وجہ تصنیف بیان کی جاتی تھی اور کوئی خیالی افسانہ شروع ہو جاتا تھا۔ ایک شاہزادہ ایک دوسری شاہزادی پر جو ہزارہا کوس کے فاصلہ پر ہوتی تھی عاشق ہوتا تھا۔ عالم خواب میں یا سیر تصویر سے وہ شاہزادی بھی گرویدہ ہوتی تھی۔ پھر اس شاہزادے کے سفر اور بیابان گردی کے حالات، طلسمی بندشیں، بہادری کے کارنامے، دیو و پری سے دست و گریبان ہونا اور وصل و ہجر کے مناظر ہوتے تھے۔ مگر اب حیدرآباد کے بعض نکتہ سنج حضرات بالخصوص اور ہندوستان کے بعض ادبار بالعموم اس مفید صنف شاعری کو مصرف میں لاکر زیادہ مفید بنا دینے کی کوشش میں سرگرم نظر آتے ہیں۔ واقعہ نگاری، نقاشیٔ فطرت اور مصوری طبیعت شروع ہو گئی ہے۔ ذرا سی نظر توجہ درکار ہے۔ مثنوی کی مٹی، سونا اور خاک، اکسیر بن سکتی ہے۔

قصائد | ۳۔ قصائد ادب اُردو میں قصائد کی تعداد بہت کافی ہے۔ متقدمین میں

سوداؔ اور ان کے بعد مختلف ادوار میں بعض شعراء نے قصائد لکھے۔ متاخرین میں امیرؔ، ذوقؔ نے اس طرف بہت توجہ کی۔

اُردو میں ہر طور کے قصیدے پائے جاتے ہیں۔

خاص اقسام ا۔ ایسے قصیدے جو حمد، نعت، منقبت میں ہوتے ہیں۔ ان میں بھی مختلف اصول ہیں۔ بعض تو فوراً ہی ممدوح کے تخاطب سے شروع ہوتے ہیں اور بعض میں تمہید و گریز، ثنا و دعا سب کچھ ہوتا ہے۔ اس صنف میں شاعری کی ابتدا عربی ہی سے ہوتی ہے اور تخئیل پرواز تصور، لطائف، خیالات، اور نکات معلومات کے لیے اس میں بڑی گنجائش ہے۔

مقصد قصائد یا تو اعتقادی نقطۂ نگاہ سے کہے جاتے ہیں یا کسی کی مدح کسی غرض سے کی جاتی ہے یا کوئی اخلاقی پہلو دکھانا مدِنظر ہوتا ہے۔ بعض جگہ کھلے الفاظ میں اعتراضات اور مذمتیں کی جاتی ہیں۔ بعض جگہ محض اعتراضات سے ہجو ملیح کی جاتی ہے۔

فائدہ مگر یہ صنف اس لحاظ سے بہت زیادہ مفید ہے کہ تشبیب یا تمہید میں بہت زیادہ وسعت ہے۔ بہار و خزاں کا رنگ انقلاباتِ عالم، علوم و فنون، سیاسی و مدنی تحریکات، فلسفیانہ، حکیمانہ، طبّی، شرعی، اصولی منطقی، تصوف و عرفان عشق و حسن غرض جو کچھ چاہیے آپ تمہید میں بیان کر سکتے ہیں۔ جس جگہ آپ ممدوح کی طرف رجوع کرتے ہیں یعنی گریز وہ نہایت نازک چیز ہے۔ اور آپ کی قادرالکلامی کا معیار ہے۔ عام طور پر قصائد میں صنائع بدائع استعارے اور مبالغے کی دھوم دھام رہتی ہے۔ مگر آپ چاہیں تو راستی و سادگی کے زیور سے معنی خیزی

وندرت پیدا کر سکتے ہیں۔

مرثیے | ۴۔ مرثیے ان کی ابتدا بھی عربی شاعری سے شروع ہوئی۔ اُسکے بعد فارسی میں پھر اُردو میں رائج ہوگئے۔ مرثیہ اپنے ایام طفلی میں کسی خاص ذات یا مقام سے وابستہ نہ تھا۔ مگر حضرت امام حسینؑ کے عبرت آموز شہادت نے ایسا عالمگیر اثر پیدا کیا کہ آج بارہ سو برس سے شاعری کی یہ صنف قریب قریب واقعات کربلا کی تصویر کشی کے لیے مخصوص ہوگئی ہے۔

بعض مرثیہ گو | اُردو کے شعراء دور اول میں ہاشم، دکاظم، میر، سودا، ولی واثر نے مرثیے کہے۔ اس کے بعد ضمیر و عشق و تعشق و حسن و فصیح نے طبع آزمائی کی مگر جو کمال انیس و دبیر کو اور اُن کے خاندان والوں کو یعنی لوچ، اُنس، مونس، عارف، حیدر، رشید، عرش، قدیم، جاوید، عروج اور دیگر کو حاصل ہوا وہ شاید ہی کسی کو ملا۔ پہلے مربع یا قطع کی شان تھی۔ اب مسدس کی ہے۔

مرثیے کے اجزاء مختلف ہیں اور ہر مرثیہ میں کم و بیش پائے جاتے ہیں۔ واقعات مختلفہ کے اعتبار سے۔

اجزا کی تعداد مختلف ہوتی ہے | (۱) چہرہ۔ جو کبھی دعا پر مشتمل ہوتا ہے۔ کبھی اپنی عاجزی یا فخر و مباہات پر۔ کبھی کسی معجزہ پر۔ کبھی امام کے واقعات سفر و منازل پر۔ کبھی شبیب کی باتوں پر۔ (۲) گریز۔ جہاں سے اصل واقعات کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

ارکان | (۳) نماز صبح (۴) صبح کا منظر۔ (۵) تیروں کا آنا۔ (۶) رخصت ہونا۔ (۷) میدان کی آمد۔ (۸) گھمسان کی لڑائی (۹) سراپا (۱۰) گھوڑے یا علم یا تلوار کی

تعریف (۱۱) ہجوم اعدا (۱۲) شہادت (۱۳) لاش کا خیمہ میں آنا۔

وسعت (۱۴) نہر کی روانی (۱۵) لاش کا پامال ہونا (۱۶) خیموں کا جلنا (۱۷) قیدیوں کا مقتل کی طرف سے لے جانا (۱۸) دربار یزید کے حالات (۱۹) قید خانہ و بازار شام کے واقعات (۲۰) حضرت امام حسینؑ اور رفقا کی نماز عصر (۲۱) فوج کی بھگدڑ (۲۲) جس رفیق یا عزیز کی شہادت ہو اسکے متعلق ضروری باتیں (۲۳) علم کے لئے عون و محمد کا اصرار (۲۴) شیریں کا قید خانہ میں آنا (۲۵) حضرت عابد کو پا بہ زنجیر صدہا کوس لیجانا (۲۶) نیزوں پر سروں کا علم کرنا (۲۷) حضرت مسلم کے حالات اُن کے بچوں کی مصیبت (۲۸) حضرت حُر کا امام حسینؑ کی فوج میں داخل ہونا (۲۹) فرشتگان اور اجنہ کا مدد کے لئے آنا۔ مگر حضرت امام حسینؑ کا مدد نہ لینا (۳۰) دیگر تمام واقعات جو حادثہ کربلا سے متعلق ہوں۔

ایک اعتراض مجھے افسوس ہے کہ بعض پڑھے لکھے حضرات مرثیہ پر یہ اعتراض فرماتے ہیں کہ انیسؔ و دبیرؔ اور ان کے پیروؤں نے بلکہ دلگیرؔ و حسنؔ کے وقت سے مرثیہ میں کافی مرثیت نہیں رہ گئی۔ ان میں شاعری، صنائع، بدائع اور بہت سی خوش کن باتیں بھی داخل ہوگئی ہیں۔

ردِ اعتراض تعجب ہے کہ ایسے حضرات ایک نہایت معمولی بات کے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے وہ یہ کہ اگر کوئی واقعہ شروع سے غم خیز اور درد انگیز الفاظ میں آخر تک بیان کیا جائے تو فطرت انسانی ہے جو اثر پڑتا ہے وہ پورا نہیں ہوتا۔ اور ایک خاص حد تک پہونچ کر گھٹنے لگتا ہے یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے فائب ہو جاتا ہے۔

فلسفۂ اثر | برخلاف اس کے، نظم ہو یا نثر، جب شاعر یا نثار کسی غمناک واقعہ کے بیان کرنے میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد کچھ ایسی چیزیں جو مسرت کا باعث ہوں بیان کر دیتا ہے تو فطرت انسانی پھر ایک بار پورے جوش کے ساتھ غم خیز اثرات کے قبول کر لینے کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ خود آپ اپنے تجربات زندگی کو سوچئے۔ اس سے میرے بیان کی شہادت مل جائے گی۔

دوسرا اعتراض | دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ بعض وقت کمزور روایات نظم کر دی جاتی ہیں۔ فقہی اور خاص شرعی اعتبار سے یہ اعتراض جس قدر مہتم بالشان ہو مجھے اُس سے غرض نہیں۔ مگر ادبی اعتبار سے کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

ردّ اعتراض | ایک باکمال مصوّر ماہر فن ادیب کا کام یہی ہے کہ جو بات بیان کرے۔ اُس کے تمام ممکن پہلوؤں کی اس صفائی و خوبی سے تصویر کھینچے کہ سُننے یا دیکھنے والے کو یہی محسوس ہو کہ ادیب خود اُس مقام پر موجود تھا۔ تمام باتیں اُسی پر گذریں اور بالکل اسی طرح گذریں جیسا وہ بیان کر رہا ہے۔ بغیر اس کے تخیل و تصوّر، فہم و ذکا، غور و فکر کا اندازہ کسی کے کلام سے ہو ہی نہیں سکتا۔

ہجو | ۵۔ ہجو۔ اس میں مخالف یا مخاطب کی کمزوریوں کا اعلان بہانگ دہل کیا جاتا ہے۔ اس کی جہالت یا بداخلاقی یا خبث باطن کا اشتہار، تمسخر و استہزا سے بھرے ہوئے سراپا کا بیان اور ہر جگہ اپنی فوقیت کا ذکر ہوتا ہے۔ سودا اور انشا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ظرافت | ۶۔ ظرافت۔ شوخی طبع اور شگفتگی مزاج کی بہترین تصویر ہے۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ دور حاضرہ میں اکبر الہ آبادی اور ظریف لکھنوی قابل قدر

ہیں۔ جنھوں نے ظرافت کو انتہا درجہ کا متین و دلچسپ سبق آمیز و عبرت خیز بنادیا ہے۔

ریختی ۷۔ ریختی۔ یہ کلام محلات شاہی کی بیگمات کی ٹکسالی زبان میں ادا کیا جاتا ہے۔ انھیں کے جذبات کا بیان انھیں کے محاورات اور روزمرہ سے لبریز ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں انشاء جان صاحب اور رنگین کا نام یادگار زمانہ رہے گا۔

متفرق نظمیں ۸۔ متفرق نظمیں۔ مولانا آزاد، حالی اور شبلی نے سب سے پہلے اُردو شاعری میں اخلاقی مدنی اور مناظر فطرت کی نظموں کی داغ بیل ڈالی ہے۔ انکے کلام میں صدق و صفا تازگی و شگفتگی، جدت و ندرت اور زور و قوت سب کچھ ہے دور حاضرہ میں اقبال، صفی، جوش، عزیز، محشر، آفسر، حفیظ نے اس طرف خاص توجہ کی ہے۔ اور اُن کی محنتیں کامیاب ہوتی جاتی ہیں۔ نظموں کا رواج دنیائے صحافت میں عام ہوتا جارہا ہے۔ اور اُمید ہے کہ اُردو میں مناظر فطرت، واقعات زندگی، مطالعۂ حیات انسانی یا دیگر مباحث پر دوسری مہذب زبانوں کے مقابلہ میں کافی سرمایہ جمع ہو جائے گا۔ کاش جو لوگ "خمریات" "بے معنی اور ارتعاش لرزاں" کی کیفیات خمار باش" میں کھوکر "مناظرۂ فطرت" سے "دو بوسہ سمجھیں" عالم رنگ و بو" میں "چرایا جاہتے ہیں" وہ بھی اپنی صلاحیت فطری کو صحیح مصرف میں لاکر خلوص و راستی سے اُردو کی خدمت کرسکیں۔

ناول اور ڈرامہ

بعض ناول نویس اُردو ناولوں کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن اصلی

مصنفوں میں ناول نویسوں کی نہایت قلت ہے۔ مرزا رسوا، شرر لکھنوی۔ محمد علی اظفر، عشرت، راشد الخیری اور آئیس کے علاوہ بہت کم ایسے ہیں جو ناول نویسی کے آئین و قواعد سے واقف ہوں۔

حسن و قبول کا راز | ناولوں اور ڈراموں کی کثرت اور عام حسنِ قبول کا سبب صرف یہی ہے کہ ان میں انسانی حرکات و جذبات کی تصویر کشی ہوتی ہے اور اسکے پڑھنے یا سمجھ لینے میں معمولی عقل و فہم سے کام لینا پڑتا ہے۔

ناول اور ڈرامہ کا اتحاد | ناول اور ڈرامہ انسانی جذبات و حرکات کا مرقع ہونے کے اعتبار سے کسی خاص طبقہ یا فرقہ کے لئے مخصوص نہیں بلکہ تمام عالم کے لئے یکساں ہیں اور دونوں بہت سی خوبیوں کے حامل ہیں۔

فرق | مگر ادبی اعتبار سے ناول نویسی۔ ڈراما نویسی سے زیادہ مشکل ہے۔ اسلئے کہ ڈراما اسٹیج پر دکھایا جاتا ہے۔ لہٰذا لباس اور اسباب، پردے اور موسیقی، آرائش اور دیگر سامان نہ صرف ڈرامے کی تکمیل کر دیتے ہیں۔ بلکہ اس کی تاثیر و عظمت میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔ برخلاف اس کے ناول کا ہر جزو زورِ قلم کا محتاج ہے۔ پھر بھی ایک مکمل ناول جیسی ڈرامہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں ایکٹر بھی ہوتے ہیں پردے بھی، لباس و اسباب اور زیب و زینت کے تمام سامان جمع ہوتے ہیں۔ اور جس طرح تماشہ دیکھتے وقت فرضی واقعات پر اصلیت کا دھوکا ہوتا ہے۔ اسی طرح اچھے ناول کے پڑھنے میں ہمارے تمام محسوسات و جذبات ہیرو کی طرح ہو جاتے ہیں۔ جب وہ ہنستا ہے تو ہم بھی بلا قصد ہنس دیتے ہیں۔ اسکو رنج پہنچتا تو ہم بھی جذبہ ہمدردی سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ غرض اس پر جو کچھ برا بھلا گذرتا

ہے ہم سب میں شریک رہتے ہیں۔ سچ پوچھیئے تو اس قدر گہرا اثر پیدا کرنے والے ناول اُردو میں بہت کم ہیں۔ ہاں دوسری زبانوں سے ترجمہ کئے ہوئے اکثر ناول عمدہ عمدہ موجود ہیں مگر ہم کو نوجوان طلباء اور قادرالکلام ادباء سے اُمید ہے کہ ناول نویسی کے فرائض عمدگی سے ادا کریں گے۔ اور ادب کے خزانہ کو مالا مال کر دیں گے۔

اُمیدیں | وہ اس طور پر کہ انگریزی، فرانسیسی، بنگالی، ترکی، یا دوسری زبانوں سے محض ترجمہ و اقتباس سے کام نہ لیں گے بلکہ کسی زبان کے کسی زبردست ناول نویس کا مکمل مطالعہ کرنے کے بعد اُسی کے رنگ میں اسی کے معیار پر قلم اُٹھائیں گے۔ یہ ضرور ہے کہ ہر جگہ اختلاف مذاق و معاشرت کا خاص خیال رکھنا ہوگا ورنہ پوری دلچسپی نہ پیدا ہوگی۔

موضوع | ۱۔ ناول نویسی کے ارکان میں سب سے اعلیٰ درجہ کی چیز موضوع یا خاکہ ہے جس کو عام طور پر پلاٹ کہا جاتا ہے۔ پلاٹ بہ نفس خود ایک فسانہ ہوتا ہے جو انسانی واقعات و حرکات پر مشتمل ہوتا ہے۔ حسن و عشق کے کارنامے۔ جذبات کی کشاکش، کامیابی و ناکامی کے تذکرے، مکر و فریب کی کارستانیاں، جاسوسی کی موشگافیاں، صدق و راستی کی رہنمائیاں، مجرم اور دغابازوں کی مکاریاں، صاحب نظر اور عقلمندوں کی تحقیق و تفتیش۔ غرض فطرت انسانی کے ہر پہلو پر کافی روشنی ڈالی جاتی ہے۔

ارتقاء و تنزل | سب سے پہلے موضوع کا ارتقاء دکھایا جاتا ہے۔ اور ایک خاص حد تک پہنچ کر زوال شروع ہو جاتا ہے۔

ہیرو یا دیگر ہستیوں کے واقعات | ۲۔ خود واقعات و سانحات جو ہیرو یا

گذرتے ہیں رہتے ہیں۔

گفتگو | ۳۔ کیرکٹروں کی آپس میں گفتگو جس سے ایک دوسرے کے حالات و واقعات ظاہر ہوتے جاتے ہیں۔

وقت اور مقام | ۴۔ وقت اور مقام۔ یعنی واقعات کا تواتر یا تعطل اور محل و مکان کی ترتیب و اختلاف میں ہمیشہ خیال رکھنا چاہیے کہ غیر فطری نہ ہونے پائے۔

طرز تحریر | ۵۔ طرز تحریر ہر مصنف کے لئے مخصوص ہونی چاہیے۔

فلسفۂ حیات | ۶۔ خود ناول نویس کا فلسفۂ حیات یا نظریہ زندگی لفظوں میں نہ سہی اشاروں میں معلوم ہو جانا چاہیے۔

ناول نویس کی ضروریات

حیات انسانی | ۱۔ مطالعۂ حیات انسانی۔ علم النفس و فلسفہ و مابعد الطبیعات سے واقفیت ہونی چاہیے۔

زور بیان | زور بیان۔ زبان پر قدرت ہونی چاہیے۔

عالم گیر تاثیر | ۳۔ عالم گیر تاثیر۔ کسی خاص قوم و قبیلہ سے مخصوص نہ ہونا چاہیے بلکہ تمام انسانوں کے جذبات کا ترجمان ہونا چاہیے۔

موسیقی | ۴۔ موسیقی اور خوش کلامی جس کے بغیر لطف و دلچسپی پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔

مناظر فطرت | ۵۔ مناظر فطرت کا مطالعہ۔ ورنہ تصویر کشی بیکار ہوگی۔

راست بیانی | ۶۔ اکثر کم نظر ناول نویس ایسے واقعات کا بیان کرتے ہیں،

جن سے وہ بذات خود بہت کم واقف ہوتے ہیں۔ اور جن کا ترک کر دینا ان کے لئے نہایت مناسب ہوتا ہے۔ اُردو کے اکثر ناول نویس ترک، عرب، عجم یا کسی اور ملک کے ہیرو پسند کرتے ہیں۔ حالانکہ مصنف صاحبان کی معلومات ان مقامات کے متعلق محض بے بنیاد اور محدود ہوتی ہے۔ چاہیے کہ جہاں کہیں کا ہیرو ہو وہاں کے تمام رسم و مراسم آئین اخلاق و معاشرت، سیاسی و علمی حالات سے باخبر ہونا ضروری ہے۔

انتخاب فسانہ ۷۔ دوسری احتیاط یہ چاہیے کہ فسانہ تازگی کی جان، دلفریبی کی روح اور قابل اظہار ہو اور عمدہ سے عمدہ الفاظ میں بیان کیا جائے۔ اسکے مختلف حصص کا تناسب و تسلسل کہیں سے بگڑنے نہ پائے ورنہ ساری محنت خاک میں مل جائے گی۔ واقعات و سانحات مافوق الفطرت اور خلاف عادت نہ ہونے چاہئیں۔

ترتیب ۸۔ پلاٹ میں اگر ایک سے زیادہ حصے ہوں تو اس طور پر ترتیب دینی چاہیے کہ سب ایک دوسرے سے دست و گریبان نظر آئیں اور واقعات کا اظہار کہیں بحیثیت تذکرہ نویس کے کرنا چاہیے کہیں شاعر کی حیثیت سے۔

ہستیاں ۹۔ افسانہ کے مرد و عورت ہماری دنیا کے تصور کے مخلوق ہونے چاہئیں۔ تاکہ ختم کتاب کے بعد بھی اُن کا اثر ہمارے دل و دماغ پر باقی رہ جائے۔

طریقہ تحریر ۱۰۔ ناول نویسی کے پہلے اکثر مشاق مصنف اپنے ذہن میں یا کاغذ پر ضروری باتیں درج کر کے ان کی منطقی ترتیب دے

لیتے ہیں اور ایسے وقت لکھنے کی ابتدا کرتے ہیں جب دماغ پر سوچتے سوچتے
محویت کی خاص حالت طاری ہو جائے اور قلم بے ساختہ چلنے لگے۔

طرزِ بیان | ۱۱۔ ناول میں ڈریمٹک یا بالواسطہ طرزِ بیان ایک خاص اہمیت
رکھتا ہے جس کے ذریعہ سے مختلف کیرکٹر خود اپنے یا دوسروں کے
جذبات و حرکات و خیال پر روشنی ڈالتے ہیں اور بلاواسطہ وہ ہے جس میں
خود مصنف کیرکٹر کے حالات کا اظہار کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بالواسطہ طرزِ بیان
بلاواسطہ طرزِ بیان کے مقابلہ میں بہت زیادہ موثر ہوتا ہے۔

ہیرو | ہیرو وہ کیریکٹر ہے جو سب سے زیادہ دلچسپ ہوتا ہے اور جسکو
ناول نویس منتخب کرکے مختلف ماحول، تجربات و حالات میں، اس کے اخلاق
و عادات، معائب و محاسن کا اظہار کرتا ہے۔ دیگر تمام ہستیوں کے حالات
ہیرو کی زندگی کے مختلف شعبوں پر اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی ناول نویس
افسانہ کے آغاز ہی سے اپنے ہیرو یا ہیروئن (عورت) کا تعارف کرادیتا ہے
اور کبھی وسطِ افسانہ سے ہوتا ہے۔ بہرحال اصولاً اس کی کوئی قید نہیں۔ جہاں
سے زیادہ فطری معلوم ہو۔ اور زیادہ دلکش ہو وہیں سے ہیرو کا تعارف
کیا جاسکتا ہے۔

وسعت | کیرکٹر سازی کی وسعت ناول نویس کی معلومات عامہ اور مشاہدات
کی کثرت پر منحصر ہے۔ ناقدین نے اس بارہ میں بہت اختلاف کیا ہے کہ پلاٹ
زیادہ اہم ہے یا کیریکٹر۔ میرے نزدیک تکمیل افسانہ کے لئے دونوں اپنے اپنے
مقام پر اہم ہیں اور بحیثیت خود ایک دوسرے کی مدد کے بغیر بے لطف

اور نا مکمل ہیں۔

گفتگو | گفتگو۔ ایک تو وہ تقریریں ہوتی ہیں جو دنیائے افسانہ کی مرد و عورت ایک دوسرے سے مختلف موقعوں پر کرتے ہیں۔ یہ تقریریں انسانی جذبات و محسوسات کی بہترین تصویریں ہوا کرتی ہیں۔ یہی تقریریں ارتقائے موضوع کے حقیقی رموز ہیں۔ ہر گفتگو وقت و محل کی مناسبت سے ہونی چاہئے اور بطور خود دلچسپ ہونی چاہیئے۔

دوسری وہ تقریریں ہوتی ہیں جو کسی مجمع کے سامنے کی جاتی ہیں اور تیسری وہ ہیں جو خود اپنے دل و دماغ سے کی جاتی ہیں۔ آخر الذکر کے لئے انگریزی میں ایک لفظ مخصوص ہے جسے Soliloquy کہتے ہیں۔ اردو میں ابھی تک سوا حدیث نفس کے اور کوئی لفظ نہیں ہے۔

ظرافت | ظرافت۔ دلگدازی اور مسرت خیزی بھی اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب الفاظ و خیالات کا صرف صحیح طور پر ہوتا ہے۔ مناظر فطرت بھی اس وقت زیادہ لطیف اور دلچسپ ہو جاتے ہیں۔ جب اُن کا تعلق دنیائے فسانہ کی زندگیوں کے جذبات و حالات سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور دماغ اشرف الانسان ہے۔

صدق در صدق | ناول نویس کے نظریہ حیات معیار صدق و اخلاق پر مبنی ہے یہاں صدق سے مراد سائنس کی صداقت نہیں بلکہ شاعرانہ صداقت ہے۔ نظم پر اعتراض کرتے وقت بعض یونانی فلاسفہ کو بھی "صداقت" کے مفہوم سمجھنے یا ظاہر کرنے میں غلط فہمی ہو گئی تھی جسے بعد کی نسلوں نے دور کر کے دودھ کا دودھ

پانی کا پانی کر دیا۔ اخلاق سے مذہبی اعتقادات مراد نہیں ہیں بلکہ ہمدردی خلایق جذبۂ اخوت و دلچسپی، صدق و صفا سے لگاؤ۔ شرافت خیال اور عالی ظرفی و پاکیزگی اعمال مقصود ہے۔

قصص

بعض قصص ادب اردو کے کسی دور میں قصہ گو اور قصہ نویس حضرات کی کمی نہیں رہی۔ شروع میں چار درویش، حاتم طائی، دہ مجلس، الف لیلہ، گل بکاؤلی وغیرہ کے چرچے تھے۔ بعد کو داستان امیر حمزہ، بوستان خیال، طلسم ہوشربا اور بہت سے چھوٹے چھوٹے قصوں نے بہت قبولیت حاصل کی۔ سروش سخن، نثر، نشتر، انشار، فسانۂ آزاد وغیرہ نے بھی عام دلچسپی کا تمغہ پایا۔ کوئی اپنے دلچسپ طرز ادا یا مقفٰے و مسجع عبارت کی وجہ سے مقبول خلایق ہوا۔ کوئی عجیب و غریب حکایات یا دلکشی و سادگی کی بدولت سرمایۂ لطف بن گیا۔

طلسم ہوشربا کی حقیقت مجھے اس سلسلہ میں داستان امیر حمزہ، طلسم ہوشربا، اور بوستان خیال کے متعلق کچھ لکھنا ہے۔ اکبر کی علم دوستی اور ہنر پروری محتاج بیان نہیں۔ تاریخ ہند کے جاننے والے "نورتن" کے "نولکھا ہار" سے خوب واقف ہیں۔ اس کے دربار میں جہاں اور تمام مذہبی علمی اور ادبی دلچسپیاں تھیں وہیں بھاشا کے قصے اور مہابھارت کے رزم نامے بھی نہایت دلچسپی سے پڑھے اور سنے جاتے تھے۔ ایک روز بادشاہ نے کہا مسلمانوں کے یہاں اس نوع کی کوئی کتاب نہیں ہے۔ ابوالفضل فوراً بول اٹھے۔

ظل اللہ موجود ہے۔ کوئی قدرداں نہیں اور ایک ہفتہ کے اندر داستان امیر حمزہ فارسی میں تصنیف کر کے پیش کر دی۔ متاخرین نے پہلے تو اصل افسانہ کو اُردو کا جامہ پہنایا اسکے بعد ہر طلسم بڑھا کر تقریبًا چھ چھ سو صفحات فی جلد کی چار چار چھ چھ جلدیں ہر طلسم کے متعلق لکھیں۔ اس وقت تمام جلدوں کی تعداد ۴۲ یا ۴۴ سے کم نہیں ہے۔ لیکن خاص طور پر جو طلسم سب سے زیادہ مقبول ہوا وہ طلسم ہوشربا ہے جو دو زبردست دماغوں کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔

بعض خوبیاں طلسم ہوشربا کی نو جلدیں (جس میں دو بقیہ طلسم بھی شامل ہیں) اس قدر ہوشربا پیرایہ میں لکھی گئی ہیں کہ جب تک تمام جلدیں ختم نہ کر لیجئے چین ہی نہیں آتا۔ پھر بھی نہیں۔ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے اور ہر مرتبہ ایک نیا لطف آتا ہے۔

مناسبت اور وضع اسمائے کثیرہ طلسم ہوشربا میں بہت کم ہستیاں ایسی ملیں گی جن کے نام مناسب موقع و محل نہ ہوں۔ اور بے انتہا کوشش کی گئی ہے کہ ایک نام کے کئی آدمی نہ ہوں اس طور پہ ہزاروں ناموں کا وضع کرنا اور اُن کو مخلوط نہ ہونے دینا بجائے خود اگر کمال نہیں تو اور کیا ہے۔

کمال مصوری طلسم ہوشربا کے واقعات مافوق الفطرت اور خلاف عادت باتوں سے شروع سے آخر تک بھرے ہوئے ہیں مگر مصوری کا کمال یہ ہے کہ جب تک پڑھتے رہئے ہر چیز اصل معلوم ہوتی ہے اور پڑھنے والا ہستیوں کے تمام محسوسات، مدرکات اور جذبات میں شریک رہتا ہے

مناظر طلسم ہوشربا میں بہار و خزاں، صبح و شام، بارش و دیار، بحر و دجلہ،

محفل و میدان، رزم جلوت خلوت، سفر و حضر کے بیش بہا مناظر ہزاروں رنگ سے دکھائے گئے ہیں۔

حفظ مراتب اور مناسبت محل

لیکن مجھ پر سب سے زیادہ دو باتوں نے اثر کیا۔ ایک تو یہ کہ حفظ مراتب اور مناسبت محل کا ہر جگہ خیال رکھا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ مصوری اُتنی کامل۔

تجزیہ سیرت

تجزیہ سیرت اس قدر نفیس اور اشارات اتنے معنی خیز ہیں کہ کسی خاص شخص کا نام ہر بار دُہرانے کی ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ صرف کنایات سے آپ کا دماغ بے ساختہ اُسی شخص کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اس کا ترجمہ و اقتباس انگریزی زبان میں ہونا چاہئے۔

بوستانِ خیال

بوستانِ خیال۔ میر تقی میر مشہور شاعر نہیں ایک دوسرے عالم جیدؔ اپنے محلہ کی جس محفل میں بیٹھا کرتے تھے وہاں ایک روز لوگوں نے طنز سے کہا کہ عالم ہونا دوسری بات ہے اور سحر نگار ہونا خداداد قابلیت پر منحصر ہے۔ جو ہر شخص کو میسر نہیں، رگ ہاشمی پھڑک اُٹھی۔ روئے سخن اپنی طرف سمجھ کر موصوف خاموش چلے آئے اور پہلے ہی مہینہ میں بوستانِ خیال کی پہلی جلد تصنیف کر کے لوگوں کو سُنائی اور تھوڑے عرصہ میں اٹھارہ (۱۸) جلدیں مکمل کر دیں۔ ترجمہ بھی نہایت عمدہ ہوا۔ تقطیع بہت بڑی ہے اور ہر جلد تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ خیالات کا ایک دریا ہے کہ موجیں لے رہا ہے۔ اُردو ادب کو اس تصنیف پر جس قدر ناز ہو کم ہے۔

بعض خصوصیات

اگرچہ صاحب بوستانِ خیال نے بھی رنگِ زمانہ کے

موافق یا فوق الفطرت اور خلاف عادت باتوں سے بعض جگہ کام لیا ہے مگر لفظوں پر نہ جائیے تو معنوی حیثیت سے حسیات و مدرکات، اثرات وافعال ذہنی تصورات و تخیلات۔ غرضیکہ دنیائے خیال کے تمام عقدے فلسفیانہ، محققانہ اور حکیمانہ انداز سے حل کئے گئے ہیں۔ اور ہر جگہ موصوف کے تبحّر علمی کا پتہ چلتا ہے۔ جس علم یا فن کا ذکر آ گیا ہے۔ صفحات کے صفحات اسی علم یا فن کی حکیمانہ تشریح مصطلحات اور تلازمہ سے بھرے ہوئے ہیں۔

باقر علی صاحب داستان گو داستان گو حضرات اب اُنگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اب نہ دلی وہ دلی رہی۔ نہ لکھنؤ وہ لکھنؤ رہ گیا۔ طبیعتیں بدل گئیں مذاق بدل گیا۔ آدمی بدل گئے۔ مختصر یہ کہ دنیا بدل گئی۔ اب بھی داستان گویوں میں میر باقر علی صاحب دہلوی زندہ ہیں۔ خدا اُن کی حیات و مسرت میں ترقی دے۔ ہر فن اور ہر کرتب کے ہزاروں متعلقات ان کو اس طرح یاد ہیں کہ سُنیے تو خدا یاد آ جائے۔

ڈرامہ

رنگِ زمانہ نوٹنکی کے ناٹک اور راجہ اندر کے اکھاڑے والی سبھاؤں کو چھوڑ کر اردو ڈرامہ کی ابتدا ابھی انگریزی ڈراموں کے تتبع اور تقلید سے ہوئی ہے۔ مگر ابھی ڈرامہ نویسی اس درجہ تک نہیں پہنچی جہاں تک پہونچنا چاہیے تھی۔ کچھ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں تھیٹر کو عام طور پر لوگ عزت و قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور کچھ اس لئے کہ خود جنھوں نے اس پیشہ کو اختیار کر رکھا ہے ان میں سے اکثر نے کسب زر و حصول منفعت کے علاوہ، اخلاقی و علمی حیثیت

سے اُس کو ترقی نہیں دی۔

اُردو ڈرامے | اُردو کے اکثر ڈرامے انگریزی یا دوسری زبانوں سے مقتبس و ماخوذ ہیں مگر تھوڑے سے اور طبع زاد بھی ہیں۔ حشر کاشمیری، آرزو لکھنوی اور برق لکھنوی عمدہ ڈرامہ نویس سمجھے جاتے ہیں۔ ادب اُردو میں ناٹک ساگر کے علاوہ اس مفید و دلچسپ بحث پر اور کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔

ڈرامہ اصولاً محتاج ہے۔

ایکٹر وغیرہ کی احتیاج | ایکٹر (تماشہ کرنے والوں) کا ہنر۔ اسٹیج کا زرق برق ساز و سامان، آلات موسیقی، لباس اور گویّوں کا کمال فن سب مل جل کر ڈرامہ کو مکمل بناتے ہیں اس لئے ڈرامہ کے پڑھنے میں وہ لطف نہیں آتا جو اُس کے دیکھنے میں آتا ہے۔ ضرورت ہے کہ جب نقادانِ فن ادبی نقطۂ نگاہ سے کسی ڈرامہ کا مطالعہ کریں تو اسٹیج کی تمام زیب و زینت، ایکٹر کی دل ربائیاں اور گانے والوں کی زمزمہ سنجیوں کو ہر جگہ نگاہ میں رکھیں ورنہ مطالعہ ناقص رہ جائے گا۔

موضوع | پلاٹ کے متعلق بہت سی باتیں ناول نویسی کے سلسلے میں آ چکیں کردی گئی ہیں جو دونوں میں مشترک ہیں۔ چند مخصوص امور کا ذکر کیا جاتا ہے۔

تسلسل و اختصار | ۱۔ ناول کے برخلاف ڈرامہ میں وقت کا تسلسل اور اختصار نہایت ضروری ہے۔

سلسلہ حرکات | ۲۔ حرکات میں بھی کافی تسلسل ہونا چاہیئے اور ایک

سین کے حالات پر دوسرے سین کے واقعات سے روشنی ڈالنی چاہیے تاکہ ناظرین کی دلچسپی شروع سے اخیر تک قائم رہے۔

مقام ۳۔ مقام۔ ایک ہی ملک کے مختلف حصص دکھائے جا سکتے ہیں مگر مختلف ممالک کے حصے دکھانا اور ان کا صحیح تسلسل قائم رکھنا بعض اوقات صرف دشوار ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے۔ اور سب سے بڑی غلطی مقام کے متعلق یہ ہوتی ہے کہ مصنف کسی غیر ملک کا کوئی حصہ پسند کرے اور اپنے ملک کی تاریخی یا مخصوص عمارات یا رسوم کا ذکر بے تکلفی سے کر دے، یہ ایسی باریک کمزوری ہے کہ انگلستان کے بے نظیر ڈرامہ نویس شیکسپیر سے بھی اکثر لغزشیں ہو گئی ہیں۔

شیکسپیر کی بعض لغزشیں مثلاً Twelfth Night کے بعض سین اٹلی میں دکھائے گئے ہیں اور لنڈن کی عمارات یا فیشن کا ذکر کیا گیا ہے۔

۴۔ گفتگو نہایت دلچسپ، حسب موقعہ اور معنی خیز ہونی چاہیے۔

تصویر کشی ۵۔ افسانہ کا ارتقار اور نقطۂ کمال پر پہونچنے کے بعد اس کا تنزل مع اسباب و علل کے اس طور پر دکھانا چاہیے کہ اصل کا دھوکا ہو جائے۔

ڈرامہ کی دو نمایاں قسمیں

ٹریجیڈی ٹریجیڈی۔ سنجیدہ۔ یعنی غم خیز یا درد انگیز حالات مثلاً تبدیلی

تکالیف، قتل، پھانسی، انتظار، ناکامی، تشدد، آگ میں جلنا، دریا میں کودنا، جہاز کا غرق ہوجانا وغیرہ وغیرہ۔

کومیڈی کومیڈی۔ ظریفانہ۔ ظرافت اور خوش طبعی سے بھری ہوئی باتیں، مذاقیہ گفتگو اور نظمیں دلچسپ تمسخر آمیز حالات یا ظریفانہ اشارات وغیرہ ہیں۔

دونوں کا اتحاد مکمل ڈرامہ میں ٹریجیڈی اور کومیڈی دونوں دوش بدوش رہتے ہیں جن کی اصلی غرض یہ ہے کہ ٹریجیڈی کے گہرے اثرات جو ناظرین کے دماغ پر پڑتے رہتے ہیں وہ مذاقیہ باتوں سے کم ہوتے جاتے ہیں تاکہ آئندہ پردوں کا اثر ان پر خاطرخواہ ہوسکے۔ ڈرامہ کا اصل مقصود مصنف کے نظریہ حیات اور فلسفۂ اخلاق کی جیتی جاگتی تصویریں دکھانا ہوتا ہے۔

ڈرامہ میں وہ گفتگو جو ایکٹر اپنے آپ سے کرتا ہے بہت زیادہ مؤثر و دلچسپ ہوتی ہے اور اسی جگہ ڈرامہ نویس کے قدرت و کمال کا پتہ چلتا ہے۔

ظرافت ڈرامہ کی ظرافت میں ذو معنے الفاظ و محاورات جان ڈال دیتے ہیں جن سے کریکٹر کچھ معنی سمجھتے ہیں اور حاضرین جو اُن سے زیادہ حالات سے واقف ہوتے ہیں دوسرے معنی سمجھتے ہیں۔

اُردو ڈرامہ کی گفتگو میں عام طور پر مقفّی عبارت استعمال کی جاتی ہے۔ مگر ایسی عبارت ڈرامہ نویسی کے اصول میں داخل نہیں بلکہ نشان آمد اور فطری اثرات کے برعکس ہوجاتی ہے۔ اُردو ڈرامہ میں ابتدا یا تعارف کا پردہ

اکثر حمد یا وطن پرستی کے نظم سے ہوتا ہے اور خاتمہ بیشتر مسرت و خوشی کی محفل سے کیا جاتا ہے۔

سادگی ڈرامہ کے لئے عام فہمی، سادگی، دلکشی اور ایسا اختصار ضروری ہے کہ پورے ڈرامہ کے دیکھنے میں چار پانچ گھنٹے سے زیادہ صرف نہ ہوں۔ انگریزی کے بعض طویل ڈرامے، اور چین کے بعض مبسوط ڈرامے (جو تین تین شبوں میں بالاقساط دکھائے گئے ہیں) انتہا درجہ کے غیر دلچسپ ثابت ہوئے ہیں۔

تمنا اُردو ڈرامہ میں نظم معرّا کا فقدان ہے جو نہایت ضروری جزو ہے اور جس کی تاثیر سامعین پر بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ زمانہ کی نئی کروٹ اُردو میں بھی بہتر سے بہتر ڈرامہ نویس پیدا کر دے گی۔ جو صرف ترجمہ و اخذ و اقتباس پر قناعت نہ کریں گے بلکہ طبعزاد ڈراموں سے بھی اُردو کا دامن مالا مال کر دیں گے۔

تنقید

عام غلطی اُردو علم ادب میں تنقید کا مفہوم اکثر حضرات نے محض تعریف یا صرف تنقیص سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ تنقید نہایت ذمہ داری کا کام ہے اور نہایت اہم بالشان چیز ہے۔ اکثر تنقیدی مضامین جو مجلات و اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اُن کا ماحصل عقیدتمندی، یا اظہار جذبات تعصب کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اگر آبگینوں کے ٹھیس لگنے

کا خیال نہ کیجئے تو آپ خود بہت سی تنقیدوں کو اسی طرح کی پائیں گے۔
مگر یہ بھی غلط ہے کہ اُردو میں صحیح تنقید کا فقدان ہے۔ حضرات دلگیر، اثر، اگہر، ناطق اور عبدالحق اس شعبہ میں بھی مذاق کا صحیح نمونہ ہیں۔

روحِ تنقید | فنِ تنقید پر بھی سوا روحِ تنقید کے جو جناب زورؔ کے قلم کا اعجاز ہے ابھی تک اور کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ ضرورت ہے کہ اس اہم شعبہ کی طرف صاحبانِ علم اور اہلِ قلم توجہ فرمائیں۔

نفسِ تنقید

نفسِ تنقید دو مقاصد پر مشتمل ہے۔

نقد | ۱۔ کلام کی تمام خوبیوں کو تمام برائیوں سے جدا کرکے دکھا دینا اور تصویر کے دونوں رُخ سامنے کر دینا۔

فیصلہ | ۲۔ پھر اپنی رائے یا فیصلہ کا اظہار دیانت داری بے تعصبی اور آزادی سے کرنا۔

مطالعہ تنقید کا فائدہ

فائدہ | بعض حضرات یہ اعتراض کرتے ہیں کہ نقاد ہمارے اور اصل مصنف کے درمیان حاجب و حائل ہوتا ہے۔ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں لہٰذا بجائے مطالعہ تنقید کے اصل تصانیف کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ یہ اعتراض ایک حد تک صحیح ہے مگر معترض حضرات پھر کا دوسرا رُخ نہیں دیکھتے۔ نقاد

اکثر اوقات ایسے لطیف نکات اور نفیس خوبیاں یا ایسی باریک اور چھپی ہوئی بُرائیاں جو ہمارے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوتیں۔ ظاہر کر دیتا ہے لہذا میرے خیال میں تنقید اور اصل تصانیف دونوں کا مطالعہ ساتھ ساتھ کرنا چاہیئے۔ ایک بات اور بھی ہے وہ یہ کہ بعض وقت مصنف کی زبان سے ہم ناواقف ہوتے ہیں اس وقت تنقید و ترجمہ ہی سے اصل تصنیف کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے جو جہالت سے بہرکیف بہتر ہے۔

ضرورت اُردو کے شعرا میں سے بعض کے کلام کی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ بعض کے دواوین کا انتخاب اور ان کی صحت ہوئی ہے مگر ان میں صرف الفاظ کے معانی اور مطالب سادہ پر قناعت کی گئی ہے اس کے لئے بے انتہا ضرورت اس بات کی ہے کہ جس طرح ایک باہمت نے "کلیات ولی" کی تدوین کی ہے یا دوسرے بالغ نظر نے "انشا کی حیات اور ظریفانہ کلام پر تنقید کی ہے۔ اسی طرح اور شعراء و ادبا کے کلام و تصانیف کی تدوین و تنقید ہونی چاہیئے۔

فرائض تنقید

ترجمانی ۱۔ ترجمانی: یعنی الفاظ و محاورات کے ساتھ ساتھ سیاسی، معاشرتی، قومی، ملکی، یا دیگر حالات کا بالتفصیل معاینہ کر کے تمام خوبیوں کو اور تمام برائیوں کو الگ الگ دکھانا چاہیئے۔

موازنہ ۲۔ جس کی تنقید منظور ہو اُس کے معاصرین اور قبل و بعد کے شعرا سے

اس کا موازنہ کرکے بلند پایہ یا کم مرتبہ ہونے کا اظہار کرنا چاہیے۔

ناقد ترجمان کی حیثیت سے

ترجمانی کا کام نہایت مشکل ہے۔ ناقد کو چاہیے کہ معانی و مطالب کی گہرائیوں تک پہنچے۔ گلوں کو کانٹوں سے الگ کرے۔ عارضی اور مستقل خوبیوں میں تمیز کرے۔ مصنف کے نظریۂ حیات و اخلاق کو عقل و ہنر کی کسوٹی پر کسے۔ کلام کے اجزائے باہمی کے تسلسل و تناسب کو آئینہ کر دے اور جو کچھ حجاب الفاظ میں ہو اُس کو منظر عام پر لائے۔

ناقد مصنف کی حیثیت سے

ناقد کا فیصلہ نہ تو اپنی پسند یا مذاق کی بنا پر ہونا چاہیے نہ دوسرے ناقدین کے زیر اثر ہونا چاہیے۔ بلکہ مطالعۂ تصانیف اور تقابلِ کلام سے آزادانہ فیصلہ اصلی فیصلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ناقد کے لیے چند شرطیں

چند شرطیں

۱۔ تبحر علمی۔ ذہن رسا۔ فنون لطیفہ سے واقفیت۔
۲۔ وسعتِ خیال و نظر۔
۳۔ غیر جانب داری۔ بے تعصبی۔
۴۔ ذاتی، مذہبی، ملکی، ملی یا تعلیمی عقائد و تعصب سے پاکیزگی۔

۵ - زبان، علم الکلام، علم اللسان، قواعد، روزمرہ، لغات، مصطلحات اور محاورات سے پوری واقفیت ۔

اخبار و رسائل کی تنقید

غلط تنقیدیں | عام طور پر اُردو اخبار و رسائل میں تنقیدیں ہوا کرتی ہیں وہ ادب و زبان دونوں کے لئے سخت مضر ہیں۔ اکثر تنقیدوں سے صرف کسب زر اور اشتہار کتاب مد نظر ہوتا ہے۔ اور کبھی کبھی محض جذبات تعصب، غصہ، نفرت، یا مودت، محبت اور عقیدت مندی کا اظہار ملحوظ خاطر ہوتا ہے۔ ضرورت ہے کہ مدیران مجلات و اخبارات صحیح طور پر تنقید کر کے دامن ادارت سے اس بدنما دھبے کو چھڑا دیں۔

بے جا تعریف، ناسزا مذمت، غیر ضروری مدح و ذم تعصب اور عقائد کا شمول تنقید کے لئے زہر ہلاہل سے کم نہیں۔ تنقید کا اصل مقصد یہ ہونا چاہئے اور یہ ہے کہ تازہ تازہ کلیوں سے عطر و جوہر کھینچ کر دیدہ زیب شیشیوں میں بھر دیا جائے اور اُس کے پہلو میں زہریلے کانٹوں اور خراب پھولوں کا عرق بھی مصفّا ظروف میں رکھ دیا جائے تاکہ سونگھنے اور سونگھنے والا خود ہی لطیف و نفیس رنگ و بو کو کثیف اور ذلیل رنگ و بو سے جُدا کر لے۔

مضمون

مضمون کے لئے انگریزی میں ایسے (essay) کا لفظ مخصوص

ے جس کے لغوی معنی کوشش اور سعی کے ہیں۔ اُردو میں اس لفظ کا کوئی مرادف مجھ کو معلوم نہیں۔ مگر عام طور پر دنیائے صحافت میں لفظ مضمون سے "ایسے" (essay) مراد لیا جاتا ہے۔

حقیقت بہر طور مضمون نویسی کا رواج عام ہوتا جاتا ہے۔ لیکن اکثر مضمون اپنے معیار اصلی کے مطابق نہیں ہوتے جس طرح اصناف شعر میں بعض نظمیں داخل ہیں۔ اسی طرح اقسام نثر میں مضمون بھی داخلی چیز ہے۔ دونوں میں انسان کسی موضوع یا مبحث پر اپنے خیالات کا اظہار مختصر مگر جامع لفظوں میں کرتا ہے اور علمی و تحقیقی مطالب نہیں بلکہ اپنے محسوسات و اثرات سے مضمون میں چار چاند لگا دیتا ہے۔ حقیقتاً مضمون نویسی بڑی مشکل چیز ہے۔ اس لحاظ سے کہ نہایت سادگی کے ساتھ چند صفحات میں کسی موضوع پر اپنے سارے خیالات کا بالترتیب ادا کرنا، کہنے میں آسان، مگر عملاً بہت مشکل ہے۔ یوں تو مضمون اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت سی مختلف حیثیتیں رکھتا ہے یعنی تاریخی، مدنی، علمی، مجلسی، ادبی وغیرہ۔

بعض خاص قسمیں لیکن ہر جگہ مصنف کے مطمح نظر سے وزن مضمون معلوم کیا جاتا ہے۔ سہولت کی غرض سے مضامین کی تقسیم تین حصوں میں ہوسکتی ہے۔

۱۔ ایسے مضامین جو مصنف کے مطالعہ و مشاہدہ پر مبنی ہوں۔

۲۔ ایسے مضامین جو تاریخی واقعات یا معلومات عامہ پر منحصر ہوں۔

۳- ایسے مضامین جن کی بنیاد مصنف کے اثرات و خیالات پر ہو۔

مضمون نویسی کے بعض ضروری اجزاء

طریقہ تحریر

۱- طریقہ تحریر۔ جب کبھی مضمون لکھنا ہو۔ تو خواہ ذہنی طور پر خواہ قلم و کاغذ کی مدد سے پورے مضمون پر غور و فکر کر لینی چاہئے۔ بہتر تو یہی ہے کہ کسی کاغذ پر تمام خیالات لکھ لیے جائیں اور بعد کو منطقی اعتبار سے مرتب کر لیے جائیں۔

انتخاب مضمون

۲- انتخاب موضوع۔ موضوع خواہ کچھ ہو اس قدر کا پسند کرنا چاہیے جو آسانی سے چند صفحات میں قلم بند ہو سکے۔

۳- اختصار اظہار خیالات اور طرز تحریر میں دل کشی و سادگی کے علاوہ اختصار کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔ مضمون زیادہ سے زیادہ اتنا طویل ہونا چاہئے جو ایک نشست میں (یعنی نصف ساعت سے ایک ساعت کے اندر) ختم کر لیا جائے ورنہ رسالہ یا صحیفہ یا کتاب ہو جائے گا۔

ذاتی خیالات

۴- مضمون اپنے موضوع کے لئے فیصلہ آرا نہ ہونا چاہئے بلکہ اُس کو مصنف کے ذاتی خیالات کا گلدستہ ہونا چاہئے۔

تسلسل و تناسب

۵- مضمون کے اجزا میں تسلسل و تناسب کا خیال رکھنا چاہیے کہیں سے کوئی بات بے جوڑ نہ ہونے پائے اور تدریجی حیثیت سے ارتقائے مضمون دکھانا چاہیے تاکہ پڑھنے والے

کا دماغ نئے خیالات کے خیر مقدم کے لئے تیار ہونا چاہئے۔ جس طرح نظم آپ کے جذبات کا آئینہ ہے اسی طرح مضمون آپ کے خیالات کا گنجینہ ہے اور وسعت کے لحاظ سے مقابلتہً زیادہ بسیط چاہیے کہ مضمون نویس خیالات کی نقاشی اور اثرات کی مصوری ایسی کرے جیسے باکمال مصور رنگ و روغن کی وجہ سے باصرہ کو لذت اندوز کرتا ہے۔

مختصر افسانہ

مختصر فسانہ اور ناول آج کل مجلات میں خصوصاً اور دنیائے صحافت میں عموماً مختصر افسانوں کی نہایت درجہ گرم بازاری ہے۔ اور عام قبولیت کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ لوگوں کو کثرت مشاغل سے طویل افسانوں اور بسیط قصص کے پڑھنے کی فرصت نہیں ملتی۔ مگر یہ خیال غلط ہے کہ مختصر فسانے دنیائے ادب سے طویل قصص کو شہر بدر کردیں گے۔ بات یہ ہے کہ جس تفصیل و تشریح و تاثیر کے ساتھ حیات انسانی کے مختلف پہلو پر طویل افسانوں میں یا ناولوں میں بحث کی جاتی ہے وہ مختصر فسانہ میں ناممکن ہے۔

اجزا مختصر فسانہ کا تعین اور اُس کے ضروری اجزا چار ہیں۔

دلکشی ۱۔ دلکش موضوع۔ ایسا کہ کسی جگہ سے طبیعت ذرا بھی اُچاٹ نہ ہو۔

اختصار ۲۔ اختصار ایسا کہ ایک نشست میں ختم ہو جائے۔

ربط ۳۔ ایسا کہ کہیں سے غلط بحث نہ ہونے پائے۔
۴۔ سادگی و راستی۔ ان خوبیوں کے متعلق کافی طور پر بحث کی جا چکی ہے۔

ایک ادبی مختصر فسانہ

موازنۂ ازمنہ فیروزہ کے باپ سعید خاں فوج میں پنج ہزاری رسالدار تھے خاندان مغلیہ کا آخری تاجدار صبح کا ستارہ بنا ہوا تھا۔ دربار کی زبان فارسی تھی مگر فوج کی بات چیت اُردو میں ہوا کرتی تھی۔ اس سادہ زبان کی لڑیوں میں عربی، فارسی، بھاشا کے انمول جواہر پروئے جاتے تھے۔ تاکہ افغان، عرب، ایرانی راجپوت، سکھ سب ایک دوسرے کی سمجھ سکیں۔ اُس وقت کا ہندوستان آج کے ہندوستان سے آگے کچھ بھی نہ تھا، کاغذی رسالوں کی یہ بھرمار جواب ہے نہ تھی۔ تعلیم بھی عام نہ تھی۔ مگر جتنی تعلیم ہوتی تھی پوری ہوتی تھی ادھوری نہیں صنعت و حرفت، شبیطنت و حکمت کی یہ گرم بازاری نہ تھی، فیکٹری، ریل، موٹر، ٹریو سے ہوائی جہاز اِن کا نام بھی کوئی نہ جانتا تھا۔ کھانے پینے کی چیزیں غیر ملکوں سے اتنے قسموں کی اور اتنی زیادہ نہیں آتی تھی۔ مگر لوگ تھے ایماندار اور چیزیں گھر کی گھر ہی میں رہتی تھیں۔ پانچ روپیہ کی آمدنی والا اپنی بیوی بچوں سمیت ایسی شان سے رہتا تھا جو آج پچاس روپیہ پانے والے کو بھی میسر نہیں۔

شرط تزویج سعید خاں نہایت سج دھج کے پٹھان تھے۔ عہدہ بھی بہت اونچا تھا۔ گھر میں خدا کا دیا سب کچھ موجود تھا۔ لڑکے بھی بہت ہوئے مگر جس کی امانت تھے اس نے چاہا لے لیا۔ اب خاں صاحب کی عمر ساٹھ سے اونچی ہو چکی تھی۔ میاں بیوی کی

بڑھاپے کا سہارا، آنکھوں کا تارا، پندرہ برس کی اکلوتی لڑکی فیروزہ تھی اُس کی شادی کے چرچے ٹولے محلے میں دن رات ہوا کرتے تھے۔ مگر خاں صاحب کی شرط ایسی ٹیڑھی تھی کہ لوگ نسبت کا پیام بھیجتے ہوئے کانپ کانپ جاتے تھے۔ شرط یہ تھی کہ دولھا اُردو کا سچّا معیار بنا سکے۔

نسبت کے پیام | مثل مشہور ہے کہ سورج بادلوں میں نہیں چھپتا۔ درخت کی گھنی ہری پتّیاں چاندنی کو روک نہیں سکتیں۔ انبیا بوری اور کوئل نے کوکو مچادی۔ بیر پھلے اور ٹڈ سیلے چلے۔ دور دور سے نسبت کے پیام آنے لگے۔ کانپور، آگرہ، پیشاور، اعظم گڈھ، حیدرآباد، لکھنؤ، لاہور، بدایوں، الہ آباد، بھوپال، علی گڈھ دہلی، امرتسر، کشمیر، تمام سے خطوط آپہنچے۔ مگر بعض ہرکاروں کے نذر ہو گئے اور بعض بغیر پڑھے ہوئے ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیے گئے۔ بعض خطوں کے ساتھ ہندی، انگریزی، روغنی، سادی، ہنسکھ، اور روانی تصویریں بھی نتھی رہتی تھیں مگر بہت کم ایسی تھیں جن سے دل و دماغ کو لطف مل سکے۔ بہرکیف چند خطوط کے نمونے آپ بھی دیکھئے۔ حضرات ذرا آنکھیں بند کر کے طے کر لیجئے کہ ہم آپ دونوں فیروزہ کی خواب گاہ کو چلمن کی آڑ سے دیکھ رہے ہیں۔

جادو محل

ناموزونیت | (آٹھ خط ہیں)

"میری ادب نوازی کا حال ہندوستان کے کہنہ مشق کہنہ دماغ، کہنہ خیال اشخاص سے پوچھ لیجیے۔ "بزرگی بہ سال است" کا مقولہ مجھ پر صادق آتا ہے، مجھ کو شجرہ بھی بہت یاد ہیں جو ادارہ ادبیہ کے بیش بہا جواہر ہیں۔"

فیروزہ اس خط کو دیکھتے ہی رحم بھری ادا سے مسکرائی اور "بڑے پاپ کی
سنک" کہہ کر موم بتی کی لو سے لگا دیا۔

حجلۂ عروس

(بیروت کے نائب ہیں)

مغرب کی کورانہ تقلید | "میں نواب التحریر ہوں۔ مجھکو غیر مرئی ذرات کے التہاب
انفراجی کا ارتعاش لطیف ارتقائے ادب کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بلند تر منازل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پر
پہونچا دیتا ہے۔ میرے ایک خاص دوست " " " " " عربی میں مایہ ناز دستگاہ
رکھتے ہیں۔ میں اپنے سامنے ـــــ نہیں سمجھتا۔ میرا نظریہ مخصوصہ یہ ہے کہ بہت سے
دماغ اور قلم میرے لئے تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے ـــــ ہیں ـــــ سو
جس چیز کو چاہوں اپنی کر دکھاؤں ـــــ میں ـــــ اعتراف گناہ ـــــ سے
معترض نہیں۔ مگر رسن بسوخت و تشنج نہ رفت کے ساتھ"

فیروزہ کی تیوریوں پر بل آ گئے اور انگلیوں نے بلا قصد عریضہ ادب کی
'مع لفافہ کے' دھجیاں اُڑا دیں۔

فسانۂ خانہ

مہلک سادگی | میرا من تیرے پریم میں اُداس رہتا ہے۔ میں جب
تیرے دھیان میں آسنی جماتا ہوں تو سُندرتا کی آبشار
کی شکل میں میری آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے۔ میرا سنگھی مجھ کو زمانہ میں
چمکائے ہوئے ہے۔ میں اُردو لکھنے پڑھنے والوں کا دل نقدی سے بھی
بڑھاتا رہتا ہوں۔

فیروزہ کے ہونٹ قہقہہ کے ساتھ کھل گئے اور اس قدر کہ دو ہلال کے

دائروں نے چودھویں کا ایک چاند بنادیا اور یہ خط ایک کنارے ڈالدیا گیا

ستارہ گھر

تجربے جا میرا ہر لفظ بلکہ ہر حرف اُردو کی حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے۔ ظرافت میری فطرت میں ہے۔ موقع ہو یا نہ ہو اپنے دوستوں کی تالیف قلوب کے لئے خاص رنگ میں ضرور لکھتا ہوں۔ میں ایسے خطہ میں رہتا ہوں جو مردم خیزی میں شیراز سے کم نہیں ہے۔

مخمارِ نفسیات!

نسائیات کا پیکر سیمیں۔ جوشش لرزاں کے ساتھ سجدہ نیاز اور پرستش خلوص!!

وہ حاشرہ کی انشائے لطیف کا ایک نمونہ

میں میکدہ ادبیات میں کیفیات خمریات وخرابیات کا مستِ شباب واحد جرعہ کش ہوں، میری تعلیمات وتربیات ناظورۂ فطرت نے کافرہ درسیات و باغیانہ عمریات سے دامن بہ کنار رکھا ہے۔ میری سرشت مستی بہ آغوش و عریانی بہ کنار۔ سیماب وشی تقلیدات وعصمت نگاہی نقلیات اپنا ماحول مقدم جانتی ہے۔ زمانہ کی ترشیاں میرے نشۂ الوہیات کو پانی بھرا رہی ہیں مگر بتدریج لطیف!!

فیروزہ کے چہرہ پر حقارت کے آثار نمایاں ہوئے اور پورا خط کمزور پیمانہ کی طرح چور چور تھا۔

چورنگ پور

غلط تراجم مجھ کو تراجم کا مالیخولیا ہے۔ میری تحک تحقیق میں دولابۂ اصطرلابی اور آلۂ مقیاس الحرارہ وغیرہ کے لائی تکنوں بصارت فروز رہتے ہیں۔

فیروزہ نے "معلوم شد" کہہ کے اس خط کو بھی چورنگ کر دیا۔

علی گڈھ

غیر منتظم اجزائے ادب "میرے ادب میں مذہب و تواریخ کا پہلو بہت نمایاں رہتا ہے۔ محیر العقول چیزیں احاطہ ترقیم میں مجال دخل نہیں پاتیں۔ شعر فہمی اور انتخاب غیر فطری طور پر میرا حصہ ہیں۔ میری تصنیف و تالیف کا بہترین حصہ کتب قدیمہ و مجلہائے حاضرہ ترکیہ و عربیہ کا شرمندہ ہے۔"

فیروزہ کی روشن خیالی نے اس بدوی مذاق کو نہایت بے نیازی سے والسلام کہا اور دوسری طرف متوجہ ہوگئی۔

دار الانشائے لطیف

بے کار افسانے مختصر فسانوں میں مجھ کو ید طولیٰ بلکہ ید بیضا ہے، فرانسیسی، بنگالی، لاطینی اور انگریزی روش مرغوب ہے۔ علمی باتوں سے بھی نفرت نہیں مگر اصلیت کی جھلک بھی نہ ہو اور کوئی خاص فائدہ نہ ہو سکے۔ میں "تلوّن طبع" ضرور ہوں۔ مگر ہر رنگ میں اس طرح ڈوب جاتا ہوں جیسے گرگٹ شریف۔

فیروزہ نے اس تحریر کو بھی دامن مجنوں بنا دیا۔

آخری خط نہایت سادہ کاغذ پر تھا۔ شان تحریر بھی کچھ ایسی اچھی نہ تھی مگر جانے کیا بات تھی کہ لفظ لفظ پر فیروزہ کا رنگ دمکتا جاتا تھا۔

قیصر آباد

اردو کا سچا معیار

"میری اُردو ہندوستانیوں کی بول چال ہے۔ مجھ کو کسی فرقہ سے کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ میرے نزدیک بُرائی جہاں کہیں ہو بُری ہے، بھلائی جس چیز میں ہو بھلی ہے۔ میرے کسی حرف کا مطلب کبھی یہ نہیں ہوتا کہ کسی کا دل دُکھے۔ مگر مجھکو ہٹ دھرمی سے، اور سچائی کے چھپانے سے بیر ہے۔"

نتیجہ

فیروزہ نے اس خط کو کئی بار پڑھا۔ نرگسی آنکھیں پھیریں، نازک انگلیوں کو جنبش ہوئی اور دو صاد ج بنا دیے گئے

اندھیرے منھ، سورج کی پہلی کرن اس خط پر پڑی، خط کے حروف نورانی ہوگئے، ص کے حلقے چمکنے لگے اور فیروزہ چودھویں کا چاند بن گئی۔ دولھا تاروں کی چھاؤں میں، فیروزہ، اُردو کی متوالی فیروزہ، کو بیاہ لایا اور دونوں پھلے پھولے۔

پرنٹر
کے۔ بی۔ اگروالا۔ سٹاننسی پریس الہ آباد

	٣٢٧	٦٨	